انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

جریدہ حیاتِ نو

مدیر مسئول: سید راشد حامدی —— مدیر: ابوالاعلی سید سبحانی

جلد: ۲، شمارہ: ۳، جولائی ۲۰۱۷ء / شوال المکرّم - ذی القعدہ ۱۴۳۸ھ

مجلس ادارت

محمد اسماعیل فلاحی .... نئی دہلی

زبیر ملک فلاحی .... لکھنؤ

انیس احمد فلاحی .... جامعۃ الفلاح

فی شمارہ:	اندرون ملک	۳۰/روپے
	بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
سالانہ زرتعاون:	اندرون ملک	۳۰۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ:	اندرون ملک	۵۰۰۰/روپے
	بیرون ملک	۳۰۰/امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

Printed, Published & Owned by Sayyed Rashid Ali,F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Printed at**: Ala Printing Press, 3636, Katra Dina Baig, Lal Kuan, Delhi-110006. **Published at**:F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Editor: Abul Aala Sayyed**

نقوشِ حیات

اداریہ	ابوالاعلی سید سبحانی	۳
اتباع دین وشریعت	پروفیسر توقیر عالم فلاحی	۵
اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۲۴)	ڈاکٹر محی الدین غازی	۲۴
افادات جلیل احسن ندویؒ (۲)	ظفر احمد الاثری	۳۰
سید مودودیؒ کے تہذیبی افکار	ضمیر الحسن خاں فلاحی	۴۸
مسئلہ فلسطین: منظر اور پس منظر	ابوالاعلی سید سبحانی	۵۹
ترانۂ فلاح: تلاش وتعبیر (۵)	ڈاکٹر امتیاز وحید	۷۲
مشاہیر کے خطوط	ادارہ	۷۸
شعر ونغمہ	حافظ احسان الحق عارف آئمی، سرفراز بزمیؔ فلاحی، اشہد بلال چمنؔ	۸۲
تعارف وتبصرہ	سعید اختر اعظمی	۸۹
آپ کے خطوط	قارئین	۹۱
جامعہ کے لیل ونہار	مصباح الباری فلاحی	۹۳
اخبار انجمن	ادارہ	۹۶

خط وکتابت وارسال زر کا پتہ

Zeeshan Apartment, F-9, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025

Email: jareedahayatenau@gmail.com

موبائل نمبر (مدیر مسئول): +91-9811126467

موبائل نمبر (مدیر): +91-9891051676

اپنی بات

امت اسلامیہ عالمی سطح پر بھی اور ملکی سطح پر بھی مختلف قسم کی آزمائشوں سے گزر رہی ہے۔ان آزمائشوں کے تعلق سے عمومی رجحان یہ پایا جاتا ہے کہ یہ امت چونکہ 'امت اسلامیہ' ہے، اس لیے اس پر 'دشمنان اسلام' کی جانب سے چوطرفہ یلغار ہورہی ہے، اور چونکہ حق و باطل کی کشمکش ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی، لہٰذا اسی کشمکش سے حق کے غلبہ اور دین کی نصرت کا راستہ نکلے گا، اور اللہ کا کلمہ بلند ہوگا۔

اس رجحان کا مطالعہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ آزمائشوں کے تعلق سے قرآنی اشارات پیش نظر رہیں۔آزمائشوں کے تعلق سے قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بنیادی اسباب چار قسم کے ہوتے ہیں:

۱۔ دعوت دین امت مسلمہ پر عائد ایک فریضہ ہے، راہِ حق کی تاریخ بتاتی ہے کہ جو لوگ بھی اس فریضے کی ادائیگی کے لیے اٹھتے ہیں انہیں سماج کے اہل حل وعقد یا چودھری قسم کے افراد کی جانب سے شدید قسم کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہر طرح سے انہیں ان کے مشن سے روکنے کی کوشش کی جاتی ہے، انہیں طرح طرح سے تکلیف پہنچائی جاتی ہے، یہاں تک کہ انہیں جان و مال اور وطن تک کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ یہ آزمائشیں مومنین کے درجات کی بلندی اور رب کی رضا کے حصول کا باعث ہوتی ہیں، لیکن بہر حال یہ اپنے آپ میں مطلوب نہیں ہیں اور نہ ہی ان کی خواہش مطلوب ہے اور نہ ہی ان کو راہِ حق کی درستگی یا نادرستگی کا معیار کہا جاسکتا ہے، البتہ اس سلسلے میں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ آزمائشوں کا سامنا ہونے پر مطلوب ثبات قدمی اور اولوالعزمی ہے، جبکہ کمزوری کا رویہ اختیار کرنا کسی بھی طور پر صحیح نہیں ہے۔

۲۔ اللہ رب العزت جب اپنے مشن کے لیے کسی فرد کو تیار کرنا چاہتا ہے تو اسے آزماتا ہے، یہ آزمائش افراد کے لیے بھی ہوسکتی ہے اور اجتماعیت کے لیے بھی۔ اس کا مقصد ہوتا ہے بندوں کو نکھارنا، ان کو بلند مراتب سے ہم کنار کرنا اور انہیں الٰہی مشن کے لیے ہر پہلو سے تیار کرنا۔ قرآن مجید میں مذکور حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے سے اس ضمن میں خاص طور سے رہنمائی ملتی ہے۔ یہ آزمائشیں ثابت قدمی کا مطالبہ کرتی ہیں، بالکل ویسی ہی ثابت قدمی جس کا مظاہرہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کیا تھا۔

۳۔ جب مسلم اجتماعیت اپنے مشن سے غافل ہوجاتی ہے تو اللہ رب العزت اسے آزمائشوں سے دوچار کرتا ہے، ان آزمائشوں کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، ان میں سے ایک صورت یہ ہے کہ جب کوئی

اجتماعیت اس الٰہی مشن سے غافل ہوجاتی ہےتو اس پراللہ رب العزت کی پھٹکار پڑتی ہے، چنانچہ اس پر ذلت اور مسکنت طاری ہوجاتی ہے۔قرآن مجید میں مذکور یہود کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مشن سے غافل ہوگئے،منکر کا ارتکاب کرنے لگے اور منکر کے ارتکاب سے آپس میں ایک دوسرے کو روکنے کے فریضے سے پہلوتہی کرنے لگے، چنانچہ ان پراللہ کا غضب نازل ہوا،جس کی تفصیل قرآن مجید میں موجود ہے۔اس نوعیت کی آزمائشیں اصلاحِ احوال کی طرف متوجہ کرتی ہیں،اوراس قسم کی آزمائشوں سے نکلنے کا راستہ یہی ہے کہ مشن سے وابستگی کی جانب اجتماعی توجہ ہو۔

۴۔الٰہی تعلیمات بندوں کو دنیا وآخرت کے سلسلے میں بہترین رہنمائی کرتی ہیں۔اس کائنات میں رہنے بسنے والے انسانوں کے سلسلے میں ان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اس سلسلے میں بھی رہنمائی کرتی ہیں اوراس کائنات کے سلسلے میں ان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اس سلسلے میں بھی رہنمائی کرتی ہیں۔کائنات میں رہنے بسنے والے انسانوں کے سلسلے میں عائد ذمہ داریوں سے غفلت اختیار کرنا بھی صحیح نہیں ہے اور کائنات کے سلسلے میں عائد ذمہ داریوں سے غفلت اختیار کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ کائنات کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں سے غافل افراد کو اس دنیا میں اللہ رب العزت کی پھٹکار کی صورت میں مختلف قسم کی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے،اقتدار وقوت سے محرومی،قہرالرجال اور ذلت ومسکنت کا طاری ہوجانا بھی اسی کا حصہ ہے۔قرآن مجید میں مذکور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا واقعہ اس کی بہت ہی واضح مثال ہے،فرعون کی غلامی،غلامی سے نجات کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کا رویہ،اور پھر ان کے ساتھ اللہ رب العزت کا معاملہ،اس پورے واقعہ کا تاریخی مطالعہ اس ضمن میں اہمیت کا حامل ہوگا۔اس نوعیت کی آزمائشیں بھی اصلاح احوال کی جانب متوجہ کرتی ہیں، کہ رب کے بندے رب کی اس کائنات کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں سے واقف ہوں اور خلافۃ الارض وعمارۃ الارض کے اپنے منصب کا حق ادا کرنے کے لیے کمربستہ ہوجائیں۔

مذکورہ بالا قرآنی اشارات کی روشنی میں امت اسلامیہ کا عالمی سطح پر بھی اور ملکی سطح پر بھی جائزہ لینے کے لیے بنیادی طور سے دو نکات پیش نظر رہنے چاہئیں:

الف: امت اپنے مشن سے کس قسم کی وابستگی رکھتی ہے،اور وہ رب کائنات کی جانب سے تفویض کردہ منصب 'خیرامت' اور 'امت وسط' کا کس حد تک حق ادا کررہی ہے۔

ب: امت اس کائنات کے سلسلے میں اپنے اوپر عائد ذمہ داریوں کو کس حد تک ادا کررہی ہے۔رب کائنات کی جانب سے تفویض کردہ منصب 'خلافۃ الارض' اور 'عمارۃ الارض' کا کس حد تک استحقاق رکھتی ہے۔

(ابوالاعلی سید سبحانی)

اتباع دین وشریعت

پروفیسر توقیر عالم فلاحی،
صدر، شعبۂ دینیات (سنی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

دین تمام انسانوں کے لیے ایک ہی تھا:

حضرت آدم علیہ السلام سب سے پہلے انسان بھی ہیں اور سب سے پہلے پیغمبر بھی۔ آپ کو اللہ رب العزت کی طرف سے جو مذہب دیا گیا تھا وہ اسلام تھا اور آپ کے بعد نبی کریم ﷺ کی بعثت مبارکہ تک تقریباً سوا لاکھ انبیاء و رسل تشریف لائے اور سب کا مذہب ایک ہی تھا۔ پوری انسانی برادری دراصل ایک ہی ملّت تھی اور تمام انبیاء کا دین ایک ہی دین تھا اور اس دین کی اصل یہ تھی کہ صرف ایک اللہ ہی دیگر تمام مخلوقات کے ساتھ ساتھ انسانوں کا رب ہے اور صرف اور صرف اُسی کی عبادت و پرستش ہونی چاہیے۔ بات دراصل یہ ہے کہ بعد میں جتنے مذاہب بھی پیدا ہوئے وہ اسی دین اسلام کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ اس دین کی کوئی تعلیم یا کوئی ہدایت کسی نے لی اور کسی دوسرے نے کوئی دوسری تعلیم و ہدایت لی اور پھر اپنی طرف سے بہت سی باتیں ملا دی گئیں، اس طرح بے شمار ملتیں وجود میں آ گئیں۔ اور پھر یہ مفروضہ بھی بڑی جرأت و ڈھٹائی کے ساتھ قائم کرلیا گیا کہ فلاں مذہب کی بنا فلاں نبی نے رکھی یا فلاں نبی فلاں مذہب کے بانی ہیں۔ بہرحال یہ سنگین غلط فہمی ہے کہ ملتوں اور مذہبوں کا تفرقہ انبیاء کرام کا ڈالا ہوا ہے۔ چونکہ ہر نبی اپنے وقت کا، خدا کی جانب سے سب سے بڑا دیانت دار اور امین ہوتا ہے۔ اس کے پیغمبر اور فرستادہ ہونے کی شان کے خلاف ہے کہ ایک خدا کے مذہب کا علمبردار ہونے کے بجائے انسانوں کو مختلف افکار و مذاہب کی طرف دعوت دے اور خدا کی بندگی کے علاوہ دوسرے معبودوں کی عبادت و پرستش کا قائل ہو اور اپنی قوم کو اس باطل طریقہ زندگی کا نقیب و پاسباں بنائے۔

قرآن مجید کی یہ آیت کریمہ اس حقیقت پر شاہد ہے:

[یہ تمہاری امت حقیقت میں ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں، پس تم میری عبادت کرو درانحالیکہ لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، سب کو ہماری طرف پلٹنا ہے(۱)]

یہ بات مفروضہ بلکہ غلط فہمی پر مبنی ہے کہ انسان کی ابتدائی زندگی شرک و بت پرستی کی تاریکیوں سے عبارت ہے بلکہ قرآن مجید صاف صاف یہ ہدایت عام کرنا چاہتا ہے اور انسانوں کے سامنے یہ حقیقت واضح کرنا چاہتا ہے کہ دنیا میں انسان کی زندگی کا آغاز معبود واحد کی مکمل واقفیت کے ساتھ ہوا ہے۔ حضرت آدمؑ کی شکل میں پہلا انسان اس دنیا میں بھیجا گیا تھا جس کی بنا پر وہ اپنے پیدا کرنے والے کا تقرب حاصل کر کے اس دنیا کی زندگی کو بھی جنت نشاں بنا سکتا تھا اور اس فانی زندگی کے بعد ہمیشہ ہمیش کی زندگی کو بھی تمام قسم کی سعادتوں سے ہمکنار کر سکتا تھا، لیکن دھیرے دھیرے نسل انسانی خدا کے پیغام کو بھولتی گئی، امتیازات، ناجائز فوائد اور مفادات کے حصول کی طلب نیز سرکشی، ظلم اور زیادتی کرنے کے جذبات اس کے محرک بنے کہ لوگوں نے الگ الگ مسالک و مذاہب بنا لیے اور ان بیساکھیوں کے سہارے ایک دوسرے پر فوقیت و برتری دکھلائی اور غلبہ و تسلط قائم کرنے کو وطیرۂ حیات بنا لیا۔ اللہ رب العالمین نے اپنی رحمت خاصہ کا سلسلہ منقطع نہیں کیا اور اولاد آدم کو انسانیت کے زیور سے آراستہ کرنے اور اپنی رضا و خوشنودی کے حصول کا خواہاں اور خوگر بنانے کے لیے اپنے محبوب ترین بندوں کو وقتاً فوقتاً ضروریات اور حالات کے لحاظ سے بھیجتا رہا، اس لیے نہیں کہ ہر نبی ایک نئے دین کا تعارف کرائے اور خدا کی بندگی کے علاوہ دوسرے باطل معبودوں (False Gods) کی پرستش کی دعوت دے بلکہ صرف اس لیے کہ اللہ کے بندے غلط جذبات، ناپسندیدہ خواہشات اور بے بنیاد مفروضات کی وجہ سے جس سیدھے راستے سے بھٹک گئے ہیں انھیں راہ راست پر لائے اور انسانوں کو ان کے مقصد تخلیق کا بھولا ہوا سبق یاد دلائے۔ اللہ رب العزت کا دین ایک ہے، ضد، ہٹ دھرمی اور سرکشی و بغاوت مختلف فرقوں اور گروہ بندیوں نیز مذاہب و ادیان کے سبب بنے۔ اس کی وضاحت اس آیت کریمہ میں ملاحظہ ہو:

[(ابتداء میں) لوگ ایک ہی طریقے پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور آپس میں بٹ گئے) تب اللہ نے انبیاء بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور گمراہی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ برحق کتاب نازل کی تا کہ حق کے بارے میں جو اختلافات رونما ہو گئے تھے، ان کا فیصلہ کرے اور اس سلسلے میں اختلاف تو ان لوگوں نے ہی کیا جنھیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ انھوں نے اختلاف کیا صرف اس لیے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے، اس کے باوجود روشن ہدایات ان تک پہنچ گئی تھیں۔ (۲)]

گویا دنیا کے سارے انسانوں کو قرآن مجید ایک خاندان کے افراد قرار دیتا ہے اور یہ متعین طور سے بتاتا ہے کہ اس خاندان کی بنیاد حضرت آدم و حوا سے پڑی (۳)۔ عقل سلیم یہ ماننے کے لیے مجبور کرتی ہے کہ ایک ہی خاندان کے تمام افراد کے لیے دین یا ضابطۂ زندگی بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ اسی

دین کے علمبردار حضرت آدمؑ بھی تھے، حضرت نوحؑ بھی تھے، حضرت ابراہیمؑ بھی تھے اور حضرت عیسیٰ وموسیٰ بھی۔ اس حقیقت کی ترجمانی اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے:

[اس نے تمہارے لیے دین کا وہی راستہ مقرر کیا جس (کے اختیار کرنے) کا نوحؑ کو حکم دیا تھا اور جس کی (اے محمدؐ) ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی ہے اور جس کا ابراہیمؑ اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا۔ وہ یہ کہ دین کو قائم رکھنا اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا۔(۴)]

خاتم الانبیاءﷺ سے بالخصوص اور آپﷺ کے حوالے سے تمام اہل ایمان سے بالعموم یہ خطاب ہوتا ہے کہ دین برحق ایک ہی ہے اور وہ ہے اسلام، اس کے علاوہ دنیا میں جو بھی ادیان و مذاہب ہیں وہ خدا کی بارگاہ میں قابل قبول نہیں ہیں (۵)، اس لیے کہ لوگوں نے مذموم جذبات، نفسانی خواہشات، ذاتی اغراض و مقاصد اور گروہی مفادات و منافع کے حصول میں عزت و وقار اور ضد و ہٹ دھرمی کے حصار میں رہتے ہوئے دین حق سے برگشتہ (Pererted) ہوکر اپنے بنائے ہوئے یا انسانوں کے بنائے ہوئے مذاہب کو طمانیت قلب (Satisfaction) کا ذریعہ بنالیا۔ یہی وجہ ہے کہ دین حق کو ماننے والوں سے مطالبہ ہوتا ہے:

[اے لوگو جو ایمان لائے ہو! پورے کے پورے طور پر اسلام میں داخل ہو جاؤ(۷)]

اللہ رب العزت کی جانب سے یہ تلقین وتنبیہ بھی ہوتی ہے کہ جن لوگوں نے انبیاء کرام کے دین سے بیزاری کا اظہار کرکے اپنی ترغیبات وخواہشات کے اسیر بن کر عام انسانوں کے بنائے ہوئے ادیان و مذاہب کو مرکز توجہ بنالیا اور انہی سے تعلق خاطر اور والہانہ وابستگی کا ثبوت دیا، وہ دراصل اس لائق نہیں ہیں کہ کسی بھی شعبۂ زندگی سے متعلق مسئلہ ومعاملہ میں ان کے گڑھے ہوئے دین سے خوشہ چینی کی جائے۔ اللہ رب العزت کا یہ ارشاد بھی قابل ملاحظہ ہے:

[جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے یقیناً ان سے تمہارا کچھ واسطہ نہیں ہے۔ ان کا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے۔ وہی ان کو بتائے گا کہ انھوں نے کیا کچھ کیا ہے(۸)]

تمام شریعتوں کا انسان سے مطالبہ:

تمام شریعتوں کا مقصد وحید یہی تھا کہ نیکیوں اور اچھائیوں کا حصول ہو اور اس مقصد کا حصول اسی وقت ممکن تھا کہ جو احکام جس زمانے میں بھی خدائے عزوجل کی طرف سے آئے ہوں انھیں بے چوں وچرا مانا جائے اور تمام قسم کے تعصّبات اور مفروضات سے بالا ہوکر ان احکام پر عمل پیرا ہوا جائے جب ہی انفرادی اور اجتماعی مصالح وفوائد (Individual and Collctive Benifits) کا حصول ممکن

ہے اور جب ہی اللہ کی رضا حاصل ہو سکتی ہے۔

اللہ رب العزت اگر جان و مال دے کر بس یوں ہی چھوڑ دیتا اور اس امتحان گاہ کے اصول کیا ہیں یا اس کے گھر میں رہنے کے طریقے کیا ہیں، ان سے اسے کوئی مطلب نہیں ہوتا تو یہ بھی درست تھا اور اس صورت میں بھی اگر وہ اس زندگی کے بعد برپا ہونے والے میدان حشر میں انسان کو ذمہ دار اور جوابدہ قرار دے کر اپنی ایک ایک امانت کا حساب و کتاب لیتا تو بھی بجا تھا لیکن اس رب العالمین کا انتہائی فضل وکرم اور بڑی عنایت و مہربانی ہے جس نے تمام انسانوں کو اپنے پیغمبروں کے ذریعہ یہ بھی بتادیا کہ خدا کی زمین پر رہتے ہوئے یا خالق السماوات والارض کے گھر میں رہتے ہوئے تمہیں زندگی کس حیثیت سے گزارنی ہے اور تمہاری زندگی کے مالک کو کیا مطلوب ہے۔ اس سلسلے میں اللہ کے عطا کردہ ہدایت نامہ قرآن مجید نے مقصد زندگی کی وضاحت یوں کردی ہے:

[ہم نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لیے کیا کہ وہ صرف میری عبادت کریں (۹)]

اسی سلسلے کی دوسری ہدایت جو قرآن مجید نے دی ہے وہ یہ کہ اللہ رب العزت نے اس دنیا کو تفریح گاہ نہیں بنایا اور نہ ہی بے کار اور لغو پیدا کیا (۱۰) بلکہ اس دنیا کو امتحان گاہ بنایا اور اس دنیا میں جو کچھ بھی ہے، اسے سامان آزمائش بنایا اور جو اس کائنات کی اشرف واکرم مخلوق ہے، (۱۱) اسے اس کائنات کا اصل امتحان دہندہ بنایا ہے۔ اس حقیقت کی تصویر کشی اس آیت کریمہ سے بھی ہوتی ہے:

[بلاشبہ جو کچھ بھی سرو سامان زمین پر ہے، اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تا کہ ان لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے اور بلاشبہ ان سب کو ہم چٹیل میدان بنادینے والے ہیں (۱۲)]

ایک جگہ اسی امتحان وآزمائش سے متعلق فرمایا جاتا ہے:

[اُسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے کام کرتا ہے (۱۳)]

دنیا میں انسان کی حیثیت اور اس کی سرگرمئ عمل کا رخ کیا ہو، اس سلسلے میں یہ ہدایت ربّانی بھی بہت واضح ہے:

[وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیے تا کہ جو کچھ تم کو دیا ہے، اس میں تمہاری آزمائش کرے (۱۴)]

دنیا کی اس امتحان گاہ میں اللہ رب العزت نے انسان کو یوں ہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ اپنے فرستادوں کے ذریعہ انسانوں کے سامنے وہ لائحۂ عمل یا ضابطۂ زندگی بھی دیا جسے شریعت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ

شریعت دنیا کے اس امتحان دہندہ کے سامنے یہ واضح کرتی رہی ہے کہ کون سے اعمال ایسے ہیں جو انسانوں کے شایان شان نہیں ہیں اور جن کے کرنے کے بعد انسان انسانیت کے درجے سے نیچے گر جاتا ہے بلکہ جانوروں سے زیادہ بدتر اور گمراہ (۱۵) اور تمام نچلوں سے نیچ ہوجاتا ہے (۱۶)۔ ایسے نقوش راہ اور فرامین بھی دیے جاتے ہیں جن کو عملی زندگی میں برت کر وہ فرشتوں سے بھی اونچے مقام کا صحیح معنوں میں اہل بن جاتا ہے اور یہ فرشتے بھی اس کے لیے دعا گو رہتے ہیں۔ اس چندروزہ زندگی کو ان تعلیمات کے مطابق گزار دینے کے نتیجے میں اللہ رب العزت کا وہ مہمان قرار پاتا ہے جہاں اس کی میزبانی اس طرح کی جائے گی کہ اس کی طلب وچاہت کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جائے گا اور اس کی مانگ ومطالبہ کی بھی قدر افزائی ہوگی (۱۷)۔

اللہ واحد پر ایمان، والدین کے ساتھ حسن سلوک، اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل کرنے کی ممانعت، فواحش سے اجتناب، انسانی جان کی حرمت وتقدس کا پاس ولحاظ، یتیموں کے مال ودولت پر نگاہِ غلط انداز نہ ڈالنا، ناپ وتول میں انصاف کرنا، عدل پر مبنی بات کہنا اور اللہ سے کیے ہوئے عہد وپیمان کو پورا کرنا یہ وہ بنیادی اور مشترک پابندیاں ہیں جو تمام شریعتوں میں عائد کی گئی ہیں (۱۸)۔

شریعتیں مختلف تھیں:

تمام شریعتیں انسان کی فلاح وبہبود کے لیے ہیں۔ اگر ان پر عمل پیرا ہوا جائے تو دنیا کی چندروزہ زندگی میں بھی امن وآشتی اور سکون وراحت کی نعمت میسر آتی ہے اور اس پر عمل کے نتیجے میں اور مشقتوں کو برداشت کرنے کے نتیجے میں اللہ رب العزت کی بارگاہ میں بھی سرخروئی وسربلندی حاصل ہوتی ہے۔ ہاں اس میں شبہہ نہیں کہ بعض حدود وقیود بعض شریعتوں میں ان کی معصیت، ناشکری اور بغاوت کے نتیجے میں عائد کی گئی ہیں۔ یہودیوں پر بعض حلال چیزوں کے حرام کرنے سے متعلق قرآن مجید کی یہ آیت کریمہ ناطق ہے:

[غرض ان یہودی بن جانے والوں کے ظلم، بکثرت اللہ کے راستے سے روکنے اور روکے جانے کے باوجود سود لینے اور لوگوں کے مال باطل طریقے سے کھانے کی بنا پر، ہم نے وہ بہت سی پاک چیزیں ان پر حرام کردیں جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں (۱۹)]

یہودی شریعت میں اکل حلال کا دائرہ ان کے معاصی وجرائم کی بنا پر تنگ کردیا گیا۔ اس کا اعلان اس ارشاد ربانی میں بھی ہوتا ہے:

[اور جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی، ان پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کردیے تھے، اور گائے اور بکری کی چربی بھی بجز اس کے جو ان کے پیٹھ یا ان کی آنتوں سے لگی رہ

جائے۔ یہ ہم نے ان کی سرکشی کی سزا دی تھی اور بلاشبہہ ہم سچ کہہ رہے ہیں]

تمام انبیاء کرام کا دین بلاشبہہ ایک ہی تھا اور خاتم الانبیا ﷺ بھی اسی دین کو لے کر تشریف لائے تھے۔ آپ کی آمد سے سلسلۂ رسالت ختم ہوگیا اور یہ دین نظریاتی اور عملی (Theoritecal and Practical) دونوں لحاظ سے مکمل ہو چکا اور آپ کو جو شریعت دی گئی وہ بھی آخری شریعت ہے اس میں بلاشبہہ بہت سی باتیں اور بہت سے احکام وہ ہیں جو دوسری شریعتوں میں نہیں ہیں۔ شریعتوں کے فرق واختلاف کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ اللہ رب العزت اپنے بندوں کو آزمانا چاہتا تھا۔ جن لوگوں کے اندر دین اور اس کی روح کا فہم ہے اور وہ دین میں متعین کیے گئے احکام وقوانین کے تقدس کو ملحوظ رکھتے ہیں اور کسی تعصب وہٹ دھرمی کے بغیر ان پر غور کرتے ہیں ان کے لیے کوئی چوں چرا کی گنجائش نہیں ہوتی اور جن لوگوں کو دین کا فہم نہیں ہے اور اس کے قوانین وضوابط کا پاس ولحاظ نہیں ہے اور نسلی وگروہی تعصب کے شکار یا ذاتی اور گروہی مفادات کے بندے بن کر احکام وضوابط کو دیکھتے ہیں ان کے اندر انحراف وبغاوت کے جذبات نشو ونما پاتے ہیں۔ بہر حال شریعتوں کا یہ فرق واختلاف آزمائش وامتحان کی غرض سے ہے۔ ارشاد ربانی ہوتا ہے:

[ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی۔ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن اس نے یہ اس لیے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ لہٰذا بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو(۲۱)]

مشرکین مکہ جہاں دین وشریعت سے متعلق بہت سی بے جا باتوں سے آپ ﷺ کی دل آزاری کرتے تھے، وہاں ایک بات یہ بھی کہتے تھے کہ بنی اسرائیل کی شریعت میں بہت سی چیزیں حرام تھیں لیکن تمہاری شریعت میں وہ ساری چیزیں حلال ہیں۔ اگر بنی اسرائیل کو شریعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی تھی اور تمہاری شریعت بھی اللہ کی طرف سے ہے تو آخر یہ تضاد واختلاف (contradiction and Discrepaney) کیسا؟ حالانکہ یہ سوال بھی حقیقت کو جانتے بوجھتے پوچھتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ دین وشریعت جس کی طرف سے ہے وہی مختار حقیقی اور مالک کل ہے۔ وہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ کن حالات میں اس کے بندوں کے لیے کون سا طریقہ زیادہ مفید ہوگا یا کون سے قوانین وضوابط زیادہ نفع بخش ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ ضد وہٹ دھرمی اور تعصب وبغاوت پر اصرار کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے کسی امت یا قوم کے لیے پاک وطیب چیزوں کے استعمال کا دائرہ تنگ کر دیا اور کسی کے لیے فضل وشرف کی بنا پر اس کا دائرہ وسیع کر دیا۔ بہر حال حالات کے تقاضوں اور حکمتوں کو جاننے والا بھی وہی ہے اور انعام

واکرام اور تنبیہ وسرزنش کرنا بھی حقیقی معنوں میں اسی کے اختیار میں ہے۔امتوں کے لیے طریقۂ زندگی یا احکام وقوانین کا مجموعہ الگ الگ ملا، اس میں مندرجہ بالا حقائق کی ہی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ہر امت کے لیے ایک شریعت کے تعلق سے یہ آیت کریمہ بھی قابل ملاحظہ ہے:

[ہر امت کے لیے ہم نے ایک طریق عبادت مقرر کیا ہے جس کی وہ پیروی کرنے والی ہے۔ پس اے محمد ﷺ! وہ اس معاملے میں تم سے جھگڑا نہ کریں۔ تم اپنے رب کی طرف دعوت دو، یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو(۲۲)]

حامل شریعت ﷺ کی عظمت:

انسانوں کی ہدایت کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہادیان دین کی خوش آئند آمد یا انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت مبارکہ کا جو سلسلہ روز اول سے قائم تھا، اس کی آخری کڑی محمد عربی ﷺ ہیں۔ اللہ کی کتاب جو شریعت محمدی کے سرچشمہ کی حیثیت رکھتی ہے، آپ کے خاتم الانبیاء ہونے پر گویا ہے:

[(لوگو) محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں(۲۳)]

محمد عربی ﷺ کی عظمت و برتری اس آیت کریمہ سے بھی عیاں ہے جس میں آپ ﷺ کے اتباع کو اللہ رب العزت اپنی محبت کی دلیل اور کسوٹی (Touchstone) قرار دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

[(اے محمدؐ) آپ لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم لوگ اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا(۲۴)]

ایک موقع پر اللہ تبارک وتعالیٰ رسول مقبول ﷺ کی عظمت کو یوں واضح فرماتا ہے:

[اور وہ خواہش نفس سے کوئی بات نہیں کہتے ہیں(۲۵)]

اللہ کے آخری رسول کو اپنا عظیم ترین اور سب سے زیادہ مستند نمائندہ قرار دیتے ہوئے اللہ رب العزت یہ سند بھی دیتا ہے:

[جس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی گویا اس نے اللہ رب العزت کی اطاعت کی(۲۶)]

انسان کی عظمت اس کے اخلاق و کردار کی بنا پر ہوتی ہے۔ آپ ﷺ بلاشبہ دنیا کے مؤقر ترین انسان ہیں اور اللہ رب العزت کے محبوب ترین پیغمبر ہیں۔ اخلاق فاضلہ کی جو انتہائی بلندی ہوسکتی ہے آپ اس پر متمکن ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ سند ملاحظہ فرمائی جائے:

[اور بلاشبہ آپ ﷺ عظیم اخلاق کے مرتبے پر فائز ہیں(۲۷)]

آپ ﷺ کی نبوت آخری نبوت ہے، قیامت تک کے لیے ہے اور رنگ ونسل اور علاقہ و برادری

کے فرق وامتیاز کے بغیر پوری انسانیت کے لیے آپ کی بعثت مبارکہ سراپا رحمت ہے۔ اس سلسلے میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

[اور اے نبی! ہم نے آپ کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں (۲۸)]

یہ بات کہ نبی کریم ﷺ صرف اپنی قوم کے لیے یا اپنے ملک کے لیے نہیں تشریف لائے بلکہ آپ پوری دنیائے انسانیت کے لیے مبعوث ہوئے ہیں، اس لیے آپ قیامت تک آنے والی پوری انسانی برادری کے لیے نبی ہیں۔ آپ ﷺ کی عالمگیر نبوت کی صداقت اس آیت کریمہ میں بھی عیاں ہے:

[(اے محمد ﷺ) آپ فرما دیجیے کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے (۲۹)]

آپ ﷺ کا مقام ومرتبہ یہ ہے کہ آپ ﷺ توراۃ اور انجیل کی بشارتوں کے مطابق ہیں اور ان کی اصل تعلیمات کی تصدیق کرنے والے اور اہل کتاب کی بعض حرکتوں کی بنا پر جو بندشیں لگا دی گئی تھیں، انھیں کھولنے والے تھے۔ ایک جگہ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے اس وحی الٰہی کو انسانوں کے سامنے گوش گزار کیا جاتا ہے:

[اور میں (اس تعلیم وہدایت کی) تصدیق کرنے والا ہوں جو تورات میں سے اس وقت میرے زمانہ میں موجود ہے اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لیے بعض ان چیزوں کو حلال کردوں جو تم پر حرام کردی گئی ہیں (۳۰)]

کفار مکہ کے ساتھ ساتھ یہود ونصاریٰ کو بھی مخاطب کر کے یہ تلقین کی جاتی ہے کہ اگر اس نبی امّی کی پیروی کرتے ہو تو یہ کوئی عجوبہ نہ ہوگا بلکہ یہ تمہارے لیے سامان رحمت ثابت ہوگا اور اس کا اتباع دراصل توراۃ وانجیل کو ماننے کے مترادف ہوگا۔ اللہ کے رسول کو شارع حقیقی کے سچّے اور مخلص ترجمان کی حیثیت سے اس آیت کریمہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔

[وہ انھیں نیک کام کا حکم دیتے ہیں اور برے کام سے روکتے ہیں اور پاک چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام ٹھہراتے ہیں اور ان پر سے بوجھ اور طوق جواُن (کے سر) پر (اور گلے میں) تھے، اتارتے ہیں (۳۱)]

محمد عربیؐ کے وحیِ الٰہی کے سچے ترجمان ہونے، اخلاق واطوار کی بلندیوں پر فائز ہونے، بلافرق وامتیاز پوری انسانی برادری کے لیے آپ کے فیضان نبوت کے عام ہونے کے پس منظر میں اور شارع حقیقی کے اصل، سچے اور مخلص نمائندہ ہونے سے متعلق قرآن وسنت کی مذکورہ بالا تعلیمات وہدایات کی

روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آپ ﷺ کی شخصیت یا آپ کی لائی گئی شریعت نمونۂ عمل ہے تمام انسانوں کے لیے، چاہے وہ دنیا کے کسی خطے سے اور کسی رنگ ونسل سے تعلق رکھتے ہوں، بشرطیکہ وہ خالق حقیقی سے ملاقات کے مشتاق اور موت کے بعد کی زندگی کے امیدوار ہوں۔فرمایا جاتا ہے:

[تم لوگوں کے لیے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے یعنی اس شخص کے لیے جو خدا سے ملنے اور روز قیامت (کے آنے) کی امید کرتا ہو اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرتا ہو (۳۲)]

شریعت محمدیہؐ کی عظمت کے چند درخشاں پہلو:

اللہ کا دین اسلام آخری اور مکمل نعمت خداوندی کی شکل میں محمد عربی ﷺ لے کر آئے چنانچہ یہ بات قطعیت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ آپ ﷺ کو جو شریعت ملی وہ مکمل اور آخری ہے اور اس نعمت عظمی کی تکمیل بھی ہے جو شریعت یا اعتقاد وعمل (Belief and Practice) کی شکل میں تمام انبیاء کرام کو اپنے اپنے وقتوں میں دی گئی۔

شریعت اسلامی کی سب سے بڑی اور نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ یہ اصولی طور پر وحی الٰہی پر مبنی ہے۔اگر قرآن مجید شریعت کا سب سے بڑا اور پہلا مصدر ہے اور سنت نبویؐ مصدر اول کی مستند ترین ترجمان ہے تو اس اعتراف حقیقت میں کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے کہ شریعت اسلامیہ وحی الٰہی پر مبنی ہے۔

چونکہ اللہ رب العزت کا دین مکمل ہے۔ہر شعبۂ زندگی اور ہر خطۂ ارض کے لوگوں کے لیے یہ دین کافی وشافی ہے۔اس دین کے علمبرداروں کو کسی دوسرے فکر وعقیدہ اور دین و مذہب سے کوئی تعلیم وہدایت مستعار لینے کی ضرورت نہیں ہے۔چنانچہ دین اسلام میں پورے کے پورے داخل ہونے کی تلقین ہوتی ہے (۳۳)۔چونکہ شریعت اسلامیہ مکمل ہے، یہاں کوئی شگاف ودراڑ نہیں ہے، اس لیے کسی قسم کی پیوندکاری کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی کوئی طریقہ یا ضابطہ دوسری شریعتوں سے اخذ کرنے کی ضرورت ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ جس دین کے آپ علمبردار ہیں اور جس کے ساتھ آپ کی بعثت مبارکہ ہوئی ہے، اس دین کو دنیا کے تمام ادیان پر غالب کردیا جائے (۳۴)، چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دین جس طرح تمام ادیان ومذاہب کی فہرست میں محض اضافہ کے لیے نہیں آیا بلکہ تمام خودساختہ اور خانہ ساز (Self-made Religions) مذاہب پر غلبہ وتفوق کے لیے آیا ہے، بعینہٖ اس کے احکام وقوانین صرف تبرک کے لیے یا محض اپنا وجود باقی رکھنے کے لیے نہیں ہیں بلکہ انھیں مروج اور غالب ہونا ہے۔یہ دین اور شریعت دوسرے تمام ادیان و مذاہب اور ان کے احکام وقوانین کو نیست ونابود کرنے کے لیے نہیں آئے ہیں، کیونکہ اسلام میں زور و زبردستی اور جبر و اکراہ کا کوئی دخل نہیں

ہے(۳۵)۔ چونکہ اللہ تعالیٰ ہی کائنات کا خالق، مالک اور مربّی حقیقی ہے اس لیے وہی انسانوں کا حاکم بھی ہے اور اسی کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ انسان کو دین اور شریعت دے کر یہ بتائے کہ اس کے گھر یا اس کی زمین پر جینے کا سلیقہ کیا ہونا چاہیے اور موت کے بعد کی زندگی کے لیے کون سا طریقہ وعمل اختیار کرنا چاہیے تاکہ اس کی ابدی زندگی بھی چین وسکون سے گزرے۔ اس لیے اس کے دین اور شریعت کو اس کی زندگی پر، دوسروں کی زندگی پر اور خالق دوجہاں کی زمین پر غالب ہونا ہی چاہیے، ہاں اگر دوسرے ادیان و مذاہب کے علمبردار اس کی رحمتوں اور عنایتوں سے مستفیض ہونا چاہیں تو اس کے لیے آسانیاں پیدا کی جائیں گی اور دروازے کھلے رکھے جائیں گے۔

دین نام ہے اللہ کے حقوق اور اللہ کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی کا۔ اللہ واحد پر ایمان رکھنے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اس کی ذات کے ساتھ ساتھ اس کی تمام صفات اور اس کے تمام اختیارات پر ایمان لایا جائے۔ نہ اس کی ذات میں کوئی شریک ہے، نہ اس کی صفات میں کوئی شریک ہے اور نہ اس کے اختیارات میں کسی کی شرکت ہے۔ اس طور پر ایمان ہی دراصل ایمان باللہ ہے اور یہ سب سے پہلا اور سب سے بڑا حق اللہ کا ہے جس کا تعلق فکر وعقیدہ سے ہے۔ اس کے علاوہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور اسی طرح قرآن مجید کی تلاوت اور ذکر وتسبیح وغیرہ یہ تمام عبادتیں عملی ہیں اور ان سب کا تعلق حقوق اللہ سے ہے۔ ان تمام معاملات کی ادائیگی میں اخلاص وللّٰہیت مرکز توجہ بن جائے اور عملاً رسول اکرم ﷺ کا طریقہ ہی ہادی و راہنما ثابت ہو۔ اسی طرح والدین کی اطاعت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا رویہ، بیوی اور بچوں کے حقوق، اعزہ و اقربا کے ساتھ صلہ رحمی، پڑوسیوں اور دیگر احباب و رفقاء کے ساتھ ہمدردی ومحبت کا سلوک و برتاؤ اور اللہ کے بندوں کی خیر وفلاح کے دیگر امور ومعاملات، ان سب کی ادائیگی میں شریعت مطہرہ نمایاں رول ادا کرتی ہے اور اس کے خوشگوار اثرات ونتائج سامنے آتے ہیں۔ گویا شریعت کا دائرہ صرف اللہ کے حقوق کی ادائیگی تک محدود نہیں ہے بلکہ اللہ کے بندوں کے حقوق بھی اس کے دائرہ کار میں آتے ہیں۔ گویا شریعت اسلامیہ کا ایک وصف یہ ہے کہ اس کا تعلق مسجد، مدرسہ یا عبادت خانہ سے ہی نہیں بلکہ تمام جگہوں اور زندگی کے تمام شعبوں سے ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ شریعت صحیح معنوں میں انسانیت نوازی اور بشر دوستی کی سب سے بڑی نقیب ہے۔ اس لیے کہ ایک شخص اللہ والا اُسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ وہ اللہ کے بندوں کے تئیں نرم رویہ اور حسن سلوک کا مظاہرہ کرے۔ حقوق اللہ سے متعلق فرائض وواجبات کی ادائیگی کما حقہ ہو اور اللہ کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی بھی جذبۂ صادق کے ساتھ ہو، شریعت اسلامیہ اس امر کو اصول اور کلیہ کے طور پر پیش کرتی ہے۔ گویا حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی ادائیگی سے متعلق شریعت کے اصول وہدایات وافر مواد فراہم کرتے ہیں۔

شریعت اسلامیہ کی ایک مہتم بالشان خصوصیت یہ ہے کہ یہ شریعت جامد (Stagnant) نہیں ہے۔یعنی اس کے اصول وقوانین اور احکام وضوابط کسی مخصوص زمانے کے لیے مفید و کارگر نہ تھے بلکہ تمام ادوار کے لیے ہیں۔ زمانۂ حال میں بھی اس کی وہی معنویت برقرار ہے جو ماضی میں تھی اور مستقبل میں بھی شریعت کی وہی معنویت برقرار رہے گی۔ اجتہاد شریعت کے مصادر میں ایک مصدر ہے۔قرآن وسنت سے گہری وابستگی کے ساتھ ساتھ اس مصدر شریعت کو استعمال کیا جاتا رہا تو مسائل کی عقدہ کشائی (Solution) کے لیے اس کے سوتے ابلتے رہیں گے اور اس کا اتباع کرنے والے ہمیشہ سیراب ہوتے رہیں گے۔

شریعت کے مآخذ:

دین اسلام کے احکام وقوانین کا پہلا مأ خذ (First Source) کتاب اللہ ہے۔ روحانی اور اخلاقی تعلیمات ہوں یا معاشرتی اور تمدنی امور، اسی طرح سیاسی معاملات ہوں یا معاشی مسائل، عائلی معاملات ہوں یا عدالتی، تمام معاملات زندگی میں اللہ رب العزت کے احکام اور اسی طرح زندگی کے جملہ امور ومسائل سے متعلق خاتم الانبیاء ﷺ کی تمام تعلیمات اور طریقوں کا نام شریعت ہے۔ان احکام وقوانین اور ہدایات وفرمودات کو دل سے مان لینے اور ان پر عمل کرنے کا نام اتباع شریعت ہے۔شریعت پر عمل پیرا ہونے کی ایک تعبیر یہ ہے کہ عبادت صرف اللہ کی ہو اور اطاعت اس کے رسول کی۔

جس طرح کلمۂ طیبہ اللہ واحد کو معبود تسلیم کر لینے اور محمد عربی ﷺ کو اس کے رسول تسلیم کر لینے کا نام ہے، اسی طرح اتباع شریعت یہ ہے کہ اللہ کے تمام احکام کو بے چوں و چرا مان لیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے رسول کی تمام تعلیمات اور تمام طریقوں کو مانا جائے اور بلا تذبذب ان پر عمل کیا جائے۔ اگر ایک شخص اللہ پر ایمان رکھنے کا مدعی ہے تو اس دعویٰ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے رسول پر ایمان لایا جائے اور یہی شریعت کو ماننا یا شریعت پر عمل پیرا ہونا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول دونوں پر ایمان اور اطاعت سے متعلق قرآن مجید میں سیکڑوں مقامات پر دلائل (Evidences) موجود ہیں(۳۶)۔ ایک جگہ جہنم کے دہکتے ہوئے شعلوں سے نجات کا جو ذریعہ بتایا جاتا ہے وہ اللہ ورسول پر ایمان ہے اور اس ایمان کے ناگزیر اور عظیم الشان تقاضے کی حیثیت سے جہاد کا تذکرہ ہوتا ہے۔فرمایا جاتا ہے:

> [اے لوگو جو ایمان لائے ہو! کیا میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمھیں دردناک عذاب سے نجات دلا دے۔ وہ یہ کہ تم لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرو(۳۷)]

اللہ رب العزت کے احکام پر بخوبی عمل پیرا اُسی وقت ہوا جا سکتا ہے جبکہ اس کا خوف دل کی دنیا پر

حکمراں ہو۔ یہ خوف ہر جگہ اور ہر گوشۂ عمل میں اللہ کے احکام کی بحسن وخوبی انجام دہی کا محرک ہوتا ہے۔ اللہ کے احکام کی مطلوبہ انجام دہی رسول ﷺ کے طریقے کو نظر انداز کر کے ممکن نہیں ہے۔ اس لیے شریعت کے مطلوب و مقصود اتباع میں ناگزیر ہے کہ اللہ پر ایمان ہو، اس کا خوف دل پر مسلط ہو اور اس کے رسول ﷺ پر بھی غیر متزلزل ایمان (Inflexible Faith) ہو، جب ہی شریعت مطہرہ پر عمل ممکن ہے اور جب ہی خدا کی رحمتوں کا نزول یقینی ہوتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

[اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ وہ تمھیں اپنی رحمت سے دوگنا اجر عطا فرمائے گا اور تمہارے لیے روشنی کر دے گا جس میں چلو گے اور تمہاری مغفرت فرما دے گا اور اللہ بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے(۳۸)]

احادیث رسول ﷺ کے مصدر شریعت ہونے سے متعلق وہ آیات کریمہ واضح ہیں جن میں اللہ رب العزت نے اپنے رسول کے مقام و مرتبہ کو علانیہ بیان فرمایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی عظمت اور ان کی احادیث کے ماٗخذ شریعت ہونے کے لیے محض یہ آیت کریمہ ہی کافی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

[اور جو چیز تم کو پیغمبر دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں (اس سے) باز رہو اور خدا سے ڈرتے رہو(۳۹)]

اجماع شریعت کا تیسرا ماٗخذ (Third Source) ہے۔ اگر قرآن مجید میں اور سنت میں کسی معاملہ سے متعلق کوئی واضح شرعی حکم موجود نہ ہو لیکن کسی زمانے میں کبار علماء امت کا کسی مسئلہ و معاملہ پر اتفاق ہو گیا تو یہ اتفاق بھی شریعت کا ماٗخذ بن جاتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی شریعت کے اس تیسرے مصدر کی طرف اشارہ موجود ہے(۴۰) اور رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان ”ان امّتی لا تجتمع علیٰ ضلالة“ کے مطابق اجماع کے مصدر ثالث ہونے سے متعلق بات صاف ہو جاتی ہے۔ اسی طرح قیاس یا اجتہاد وہ ماٗخذ شریعت ہے جس کی وجہ سے شریعت اسلامیہ کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوتے اور ہر دور اور ہر معاملے میں شریعت کا یہ مصدر شریعت کی معنویت بڑھا دیتا ہے۔ قرآن مجید میں تدبر، تفکر اور تعقّل سے متعلق متعدد آیات کریمہ ہیں۔ ان تعلیمات کی روشنی میں اجتہاد کی معقولیت و معنویت ثابت شدہ حقیقت بن جاتی ہے۔ بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اجماع ہو یا قیاس و اجتہاد، یہ دونوں قابل قدر اُسی وقت ہیں یا یوں کہا جائے کہ یہ دونوں مصادر شریعت قابل قبول اُسی وقت ہوتے ہیں جب انہیں قرآن اور سنت کے دائرے میں برتا جائے یا کم از کم یہ کہ کسی مسئلے پر اجماع قرآن و سنت کی روح سے متضاد و متصادم نہیں ہونا چاہیے۔ گویا قرآن و سنت اہم ترین مصادر شریعت ہیں جن کی تعلیمات و احکام کی بجا آوری یا اتباع شریعت میں بہر حال پیش نظر ہونی چاہیے اور دیگر دو مصادر شریعت وہ ہیں جن میں

قرآن وسنت سے عدم تناقض کی روح برقرار رہتی ہے۔

اتباع شریعت تقاضائے ایمان:

اسلام عملی مذہب ہے۔ایک شخص لا اِلٰہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کا ورد شب وروز کرتا رہے لیکن اس کے تقاضوں سے بے التفاتی برتتے یا روگردانی کرے تو ایسا شخص کبھی اپنے دعوئ ایمان میں سچا اور مخلص نہیں ہوسکتا اور نہ اس کا ایمان اس کے لیے نفع بخش ہوسکتا ہے۔اس کے برعکس اگر ایک شخص کلمہ طیبہ دن ورات کے اوقات میں ایک بار بھی نہ پڑھے لیکن جو اس کے مطالبات ہیں ان کی انجام دہی میں متحرک وفعال اور محتاط ومتقی ہونے کا ثبوت دے وہ دین کا مخلص، پیرو اور شریعت کا سچا ترجمان ہے۔ہاں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج یا قرآن پاک کی تلاوت اور مخصوص اوقات کے افکار واوراد کا نام ہی صرف شریعت نہیں ہے بلکہ زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق قرآن وسنت کی روشنی میں دین کے جو بھی مقتضیات یا لوازمات (Requirements ro Ingredients) ہیں، ان سب پر شرح صدر کے ساتھ عمل کرنا ہی دراصل دین کے تقاضوں کی تکمیل اور شریعت مطہرہ کا صحیح معنوں میں اتباع ہے۔

گویا صحیح معنوں میں متبع شریعت وہ ہوگا جو اپنے پورے وجود کو اللہ کے حوالے کردے۔ایک اصل دیندار اور موحد کی طرف سے جو اعلان (۴۱) ہوتا ہے وہ عملی طور پر اس کی زندگی کا جزو لاینفک (Indispensable part) بھی بن جائے، اتباع شریعت میں یہی مطلوب ومقصود ہے۔

کلمۂ طیبہ کے سچے علمبردار اور ایک اصل موحد کی شان یہی ہوتی ہے کہ زندگی کے جملہ امور میں رضائے الٰہی کا طلب گار ہوتا ہے۔اس کی زندگی صحیح معنوں میں اس عظیم الشان موحدانہ اعلان کا ترجمان بن جاتی ہے:

[(اے محمد ﷺ) کہہ دیجیے کہ میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا، سب خدائے رب العالمین ہی کے لیے ہے]

اتباع شریعت میں ہوائے نفس (Sensual Desire) کا اسیر ہوجانا زبردست مانع (Major Obstruction) ہے۔نفس کا غلام بن جانے والا شخص صحیح معنوں میں افراط وتفریط کا شکار ہوجاتا ہے اور بالآخر وہ صراط مستقیم سے پھر جاتا ہے۔ایسا شخص جائز وناجائز، حق وناحق، صحیح وغلط اور حسن وقبح کے سارے حدود پھلانگ کر اپنی ترجیحات وخواہشات کے آگے سپر ڈال دیتا ہے اور اخلاق وکردار کے لحاظ سے وہ جانور بلکہ جانور سے بدتر ہوجاتا ہے۔قرآن مجید کی یہ تنبیہ ملاحظہ فرمائیے:

[کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے خواہش نفس کو معبود بنا رکھا ہے؟ تو کیا تم اس پر نگہبان ہوسکتے ہو یا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ان میں اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں۔نہیں، یہ تو

چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں (۴۳)]

اس کے برعکس اگر انسان نفس رکھتے ہوئے جائز و ناجائز، پاک و ناپاک، طیب وخبیث اور حلال وحرام کی تمیز کے ساتھ زندگی گزارتا ہے اور ہر معاملۂ زندگی میں رضائے الٰہی اس کے لیے ضابطہ وحکمراں (Controller) بن جاتی ہے تو وہ صحیح معنوں میں احسن تقویم (Best Mould) پر فائز ہو جاتا ہے (۴۴) اور تمام مخلوقات میں آدم وحوا کی اولاد اس شرف وکرم اور فضل و برتری کی مستحق بن جاتی ہے جس سے خالق دوجہاں اور مالک حقیقی نے نوازا ہے۔

بلاشبہ نفس انسان بھی رکھتا ہے اور جانور بھی، لیکن جانور کو نہ ہی شعور بخشا گیا ہے اور نہ ہی وہ خالق دوجہاں کی اس کائنات میں امتحان دہندہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے حدود وقیود کو پھلانگ کر ہر کھیت میں منھ مارنا اس سے متوقع ہی نہیں بلکہ اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اس کے برعکس انسان اشرف المخلوقات ہے۔ وہ اس زمین پر اپنے خالق ومالک کا نائب ہے۔ بلاشبہہ مادّی اور نفسانی خواہشات بھی اسے ودیعت کی گئی ہیں، لیکن اسے شعور واختیار بھی دیا گیا ہے اور یہی انسان اس دنیائے فانی کا اصل امتحان دہندہ ہے۔ اس امتحان گاہ میں اپنی خواہشات کو بے لگام نہ چھوڑ کر اگر وہ جائز وناجائز، حق وناحق اور صحیح وغلط کے استعمال میں مرضی مولا کے حصول کا خواہاں اور طریقہ نبوی پر عامل رہتا ہے اور خدا کی بارگاہ میں پیشی کے وقت اپنے ہر ہر عمل کے بدلے کے لیے فکرمند رہتا ہے تو گویا سعادت وخوش بختی کی معراج حاصل کر لیتا ہے اور آقائے نامدار ﷺ کے فرمان کے مطابق بڑا دانش منداور ذکی وفہیم قرار پاتا ہے۔ فرمان نبوی ﷺ ملاحظہ فرمائیں:

[ہم میں اصل دانا وعقل مند وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو قابو میں کر لے اور موت کے بعد کی زندگی کے لیے عمل کرے (۴۵)]

ہوائے نفس کی پیروی ایک انسان کو جانور کے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے کجا یہ کہ وہ شریعت کا متبع ہو کر راہ راست پر گامزن ہو جائے۔ خواہشاتِ نفس شریعت کے تابع ہو جائیں، یہ کسوٹی ہے کسی کے شاہراہ ایمان پر قائم رہنے کی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اپنا محاسبہ کرنا چاہیے اور اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے۔ رسول اکرم ﷺ کا یہ فرمان بہت واضح ہے:

[تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوگا جب تک کہ اس کی خواہشات نفس میری لائی گئی شریعت کے تابع نہ ہو جائیں (۴۶)]

اتباع شریعت میں سمجھوتہ نہیں:

اسلام اس بات کا شدید مخالف ہے کہ لوگوں کو مذہب کا علم بردار بنانے کے لیے مجبور کیا جائے۔

زور وزبردستی اور جبر واکراہ دین اسلام کی شان کے خلاف ہے۔ مذہب اسلام کے منشور قرآن مجید میں جگہ جگہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے محبوب ترین نبی کے واسطے سے دین اسلام کے شیدائیوں کو یہ سبق گوش گزار کرتا ہے کہ تم اللہ کے دین کی امانت اللہ کے بندوں تک پہنچانے میں صلاحیت واستعداد اور حکمت ودانائی کو بطور زادِ راہ تو اختیار کرو لیکن ہدایت کا معاملہ اللہ رب العزت سے متعلق ہے، اس لیے تم ہدایت دینے پر مأمور نہیں کیے گئے ہو۔ اگر مدعو شخص یا مدعو گروہ میں جذبۂ صادق اور ہدایت کی طلب وجستجو ہے تو اللہ تعالیٰ یقیناً اسے ہدایت کی نعمت دے گا۔

اس کے برعکس دین اسلام کی امانت جن کے کاندھوں پر ہے ان سے مطالبہ ہوتا ہے کہ اللہ کی شریعت زندگی کے تمام معاملات میں کافی وشافی رہنمائی کرتی ہے اور یہاں کسی قسم کی پیوندکاری کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی بدلتے ہوئے احوال میں اس شریعت کے تعلق سے کسی قسم کی محرومی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس لیے تمام معاملات میں اللہ کی شریعت کو ہی ہادی ومقتدی بنایا جائے اور اس سلسلے میں مذہب اسلام سے بعد وتنفر رکھنے والے کسی بھی فرد یا گروہ کی خواہشات ومطالبات کو خاطر میں نہ لایا جائے۔ فرمان خداوندی ہے:

[اور اپنے پروردگار کی کتاب کو جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے، پڑھ کر سنا دیجئے۔ اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں اور اس کے سوا تم کہیں پناہ بھی نہ پاؤ گے(۴۶)]

شریعت پر مخلصانہ طریقے سے عمل پیرا ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ خود بھی اس سلسلے میں دیانت داری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی عملی زندگی میں اسے نافذ کیا جائے اور حرص وطمع کے دام میں آئے بغیر یا خوف وہراس کی کیفیت سے دوچار ہوئے بغیر اسے اللہ کے ان بندوں تک منتقل کیا جائے جو کسی وجہ سے اس کی اہمیت کو نہیں جانتے اور اس سے دوری اختیار کرتے ہیں۔ اللہ رب العزت رسول مقبول ﷺ کو اصل مخاطب بناتے ہوئے تمام پیروانِ اسلام کو تلقین فرماتا ہے:

[(اے رسول ﷺ!) جو کچھ آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ پر نازل ہوا ہے وہ (لوگوں تک) پہنچا دیجیے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے خدا کے پیغام کو نہیں پہنچایا اور اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو لوگوں سے بچالے گا(۴۷)]

قرآن مجید کے واضح اور درخشاں احکام وہدایات کے آجانے کے بعد اور ان کی تفسیر وتوضیح کی شکل میں مبرہن تعلیمات نبوی کے بعد خواہشات نفس کو دخیل بنانا دین کے کسی بھی علمبردار کو زیب نہیں دیتا(۴۸) بلکہ کسی بھی ایسے شخص کے لیے یہ طریقہ وعمل سودمند نہیں ہوسکتا جو اپنے خالق ومالک کی بتائی گئی سیدھی راہ پر چلنے کے لیے پرعزم اور مستعد ہو۔ اسی لیے اللہ رب العزت اپنے پیارے رسول کو

مخاطب بناتے ہوئے دین اسلام کو مان کر اپنی زندگیوں کو منور کرنے والے تمام ہی انسانوں سے بالواسطہ خطاب کرتا ہے کہ شریعت پر ثابت قدمی کا طریقہ اختیار کیا جائے اور اس سلسلے میں مدعو فرد یا مدعو معاشرہ کے سامنے اپنے موقف کو واضح کر دیا جائے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

[تو اے محمد ﷺ! (اس دین کی طرف لوگوں کو) دعوت دیتے رہیے اور جس چیز کا آپ کو حکم ہوا ہے اس پر قائم رہیے، اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجیے اور آپ فرما دیجیے کہ جو کتاب اللہ نے نازل کی ہے اس پر میں ایمان رکھتا ہوں اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔ خدا ہی ہمارا اور تمہارا پروردگار ہے۔ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال (۴۹)]

وہ حضرات جو آپ ﷺ کی دعوت کے براہ راست مخاطب تھے اور داعیٔ اعظم ﷺ اور آپ کے رفقاء واحباب کی راہ میں ہر طرح کے موانع ومشکلات پیدا کر رہے تھے، وہ اس بات کے لیے کوشاں تھے کہ ان کے درمیان یہ سمجھوتہ ہو جائے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے معبودوں کو مان لیں اور ان کی پرستش کریں، اللہ کی نگاہ میں یہ بے جا جسارت اور بڑا ہی سنگین جرم تھا اور اس پیش کش پر اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو جو موقف اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے، وہ ان آیات کریمہ سے بخوبی ظاہر ہے:

[(اے محمد ﷺ) آپ کہہ دیجیے کہ اے کافرو! نہ میں پوجوں گا جن کو تم پوجتے ہو اور نہ تم پوجتے کہ جسے میں پوجتا ہوں اور نہ میں پوجنے والا ہوں جن کو تم نے پوجا اور نہ تم پوجنے والے ہوئے جسے میں پوجتا آ رہا ہوں، تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین (۵۰)]

معبودانِ باطل کے تئیں عقیدت ومحبت کا رجحان اور اس سلسلے میں کوئی پیش قدمی (Initiativen) انتہائی بدترین کردار اور سنگین ترین جرم ہے۔ دین انتہائی قیمتی دولت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اللہ کے بندوں کو ملتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا امین اور پہلا مخاطب اللہ کا رسول یا پیغمبر ہوتا ہے۔ اسلام کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اپنی عظیم ترین روحانی نعمت کی تکمیل اپنے انتہائی محبوب پیغمبر محمد عربیؐ پر کر دی ہے۔ آپ ﷺ اس کے مخاطب اول ہیں اور آپ سے تقاضا ہوتا ہے کہ بے کم وکاست اس دین پر عمل پیرا ہوں اور دوسروں تک پہنچائیں۔

دین اسلام یا اسلامی شریعت ہر فرد کے لیے، ہر قوم کے لیے بلکہ پوری انسانی برادری کے لیے رحمت ہے۔ اس کی وہ تعلیمات جو قرآن وسنت سے ماخوذ ہیں بلا فرق وامتیاز تمام انسانوں کو اس دنیا میں بھی امن وسکون اور عزت ووقار کے ساتھ جینے کا سبق سکھاتی ہیں اور اس دنیائے فانی کے بعد لافانی دنیا اور ہمیشہ ہمیش کی زندگی میں بھی سعادت کی ضامن بنتی ہیں۔ اس کے باوجود آج عام انسانی برادری

اسلام کو اپنے لیے خطرہ سمجھتی ہے اوراس کے نورانی چہرے کو مسخ کرنے کی تمام تر سازشوں میں ملوث ہے۔ اسلام کے علمبرداروں سے مطالبہ ہوتا ہے کہ وہ دین و مذہب کو محدود جگہوں کے لیے اور مخصوص شعبہ ہائے زندگی میں دخیل بنائیں۔ ان کے اس تجویز کردہ نسخے پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ پوری زندگی مذہبی نہ ہو اور مفادات ونفسانی خواہشات کو ملحوظ رکھتے ہوئے دین وشریعت کا پیامی بنا جائے۔ صداقت تو یوں نظر آتی ہے کہ جو جتنا اسلام سے دور ہوگا یا جو بھی اسلام کو ہلکے انداز سے اپنانے کا قائل ہوگا، اسی کی طرف سے وحشیانہ حرکتیں (Brutal Activities) اور غیر انسانی کردار (Inhuman Character) کا مظاہرہ ہوگا اور سب سے بڑی بات یہ کہ رب العالمین اور احکم الحاکمین کے دیے گئے احکام وقوانین سے بغاوت ہوگی۔ آج اگرچہ باطل طاقتیں اسلام کے رخ زیبا کو داغدار کرنے میں لگی ہیں، کرسی واقتدار کی لالچ بھی دلائی جارہی ہے اور خوف وہراس کا ماحول بھی پیدا کیا جارہا ہے۔ حالات چاہے جیسے بھی ہوں، اسلام کے علمبردار سے تقاضا ہوتا ہے کہ مفادات کے حصول میں نہ تو اپنی زندگی میں خودساختہ شریعت کو نافذ کریں اور نہ ہی باطل طاقتوں سے مرعوب وخوفزدہ ہوکر مصلحت پسندی کا شکار بن جائیں اور آدھے اسلام کو پیش کرکے دنیائے انسانیت کو اللہ کے دین اور اس کی شریعت کی برکتوں سے محروم کرنے کی جسارت کریں۔

تاریخ شاہد ہے کہ داعیٔ اعظم ﷺ جب مکہ کے پرآشوب ماحول میں بے کم وکاست دعوت پیش کررہے تھے تو کفار ومشرکین یہی چاہتے تھے کہ محمد ﷺ کوئی ایسا دین لائیں جو ان کے آباء واجداد کے دین کی لو کو مدھم نہ کردے اور کوئی ایسا قرآن لے آئیں جس میں ان کے معبودان باطل لات، عزیٰ، ہبل اور منات وغیرہ کی بھی عزت وتکریم داؤ پر نہ لگے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے کسی بھی حال میں ان کی اس خواہش کو ملحوظ نہ رکھا اور نہ ہی کبھی ان کے حاشیۂ ذہن میں معبودان باطل کی عقیدت کے تئیں نرم گوشہ آیا۔ لیکن شریعت کو اپنی خواہشات کے مطابق کردینے والوں یا دوسروں کی رو رعایت میں شریعت میں حذف واضافہ کرنے والوں کو آپ ﷺ کے توسط سے جو انتہائی درجہ کی تنبیہ کی گئی ہے وہ قابل ملاحظہ ہے:

[اگر یہ پیغمبر ہماری نسبت کوئی جھوٹ بات بنالائے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے، پھر ان کی رگ گردن کاٹ ڈالتے (۵۱)]

قرآن وسنت کی تعلیمات اس سلسلے میں بہت واضح ہیں کہ دنیا کے تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ جب پوری انسانی برادری ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہے تو ان سب کے لیے زندگی گزارنے کا ایک ہی آئیڈیل طریقہ چاہیے تھا۔ چنانچہ دین اسلام وہ دین ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام تا

خاتم الانبیاء محمد عربی ﷺ اسی دین کے ساتھ مبعوث ہوئے۔ اللہ کے بھیجے ہوئے فرستادے مختلف زمانوں میں، مختلف علاقوں میں اور مختلف احوال وکوائف میں تشریف لائے، اس لیے شریعتیں ضروریات اور حالات کے مطابق الگ الگ رہیں۔ محمد عربی جس دین کو لے کر آئے وہ دین مکمل، تمام ضروریات کا کفیل، دونوں جہاں کی سعادتوں کا ضامن اور پوری انسانی برادری کے لیے شرف وسعادت بن کر آیا۔

قرآن مجید اس دین کا مستند ترین منشور (Most Authentic Manifesto) ہے اور اس کے سب سے بڑے داعی ونقیب محمد عربی ﷺ ہیں۔ آپ نذیر وبشیر ہیں اور آپ کی بعثت مبارکہ پوری دنیا کے لیے رحمت ہے۔ آپ جو شریعت لے کر آئے وہ وحی الٰہی پر مبنی اور اللہ رب العزت اور اس کے رسول کے احکام وفرامین اور تعلیمات وہدایات کا نام ہے۔ اجماع اور قیاس بھی بلاشبہہ شریعت کے قیمتی مآخذ (Sources) ہیں جنھیں شریعت کی معنویت کے تعین میں کسی بھی قیمت پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، ہاں یہ مراجع قرآن اور سنت کی روح سے متضاد نہیں ہوتے۔ یا یوں کہا جائے کہ قرآن وسنت کی روح سے یہ مصادر مزین ہوتے ہیں۔ یہ شریعت وحی الٰہی پر مبنی، عالمگیر، حقوق اللہ اور حقوق العباد پر مشتمل اور تمام ادوار واحوال میں تمام ہی انسانوں کے مسائل کے حل کی صلاحیت اس کے اندر موجود ہے۔ اتباع شریعت تقاضائے ایمان ہے۔ نفسانی خواہشات اتباع شریعت میں مانع ہی نہیں بلکہ انسان کو انسانیت کے مقام ومرتبہ سے گرادینے کی محرک بنتی ہیں۔ شریعت اسلامیہ دین اسلام کی مکمل ترجمان ہے۔ جس طرح دین اسلام مکمل ہے اور تمام عیوب سے پاک ہے اسی طرح شریعت اسلامیہ صاف وشفاف (Transparent) اور تمام خامیوں سے مبرا ہے۔ اس لیے یہ شریعت زندگی کے تمام معاملات میں فیصلہ کن رول ادا کرتی ہے۔ کسی بھی مذہب یا اس کی شریعت کو لعن طعن یا سب وشتم کا نشانہ بنایا جانا جرم ہے لیکن اس سے زیادہ سنگین جرم یہ ہے کہ دین وشریعت کے معاملے میں بے جا مصالحت، نرم پالیسی یا سمجھوتے کا طریقہ اختیار کیا جائے، جس سے شریعت کا اصل چہرہ غبار آلود ہوجائے۔

حواشی و مراجع:

(۱) الانبیاء:۹۳ (۲) البقرہ:۲۱۳

(۳) الحجرات:۱۳ (۴) الشوریٰ:۱۳

(۵) آل عمران:۸۵

(۶) الراغب الاصفہانی: المفردات فی غریب القرآن، ص ۱۷۵، دار المعرفۃ، بیروت

(۷) البقرہ:۲۰۸ (۸) الانعام:۱۵۹

(۹) الذاریات:۵۶ (۱۰) ص:۲۷

(۱۱) الاسراء:۷۰ (۱۲) الکہف:۷-۸
(۱۳) الملک:۲ (۱۴) الانعام:۱۶۵
(۱۵) الفرقان:۴۳-۴۴ (۱۶) التین:۴
(۱۷) فصلت:۳۰-۳۲ (۱۸) الانعام:۱۵۱-۱۵۲
(۱۹) النساء:۱۶۰-۱۶۱ (۲۰) الانعام:۱۴۶
(۲۱) المائدہ:۴۸ (۲۲) الحج:۶۷
(۲۳) الاحزاب:۴۱ (۲۴) آل عمران:۳۱
(۲۵) النجم:۳ (۲۶) النساء:۸۰
(۲۷) القلم:۴ (۲۸) سبا:۲۸
(۲۹) الاعراف:۱۵۸ (۳۰) آل عمران:۵۱
(۳۱) الاعراف:۱۵۷ (۳۲) الاحزاب:۲۱
(۳۳) البقرہ:۲۰۸
(۳۴) آیات کریمہ ملاحظہ فرمائیں، التوبۃ:۳۳؛ الفتح:۱۸، الصّف:۹
(۳۵) البقرہ:۲۵۶
(۳۶) بطور مثال ملاحظہ ہو النساء: ۵۹، ۱۳۶، آل عمران: ۳۲، الانفال: ۲۰، النور: ۶۲، الحجرات:۱۵، الفتح:۱۳
(۳۷) الصّف:۱۰ (۳۸) الحدید:۲۸
(۳۹) الحشر:۷ (۴۰) النساء:۵۹
(۴۱) الانعام:۷۹ (۴۲) الانعام:۱۶۲
(۴۳) الفرقان:۴۳-۴۴ (۴۴) التین:۴
(۴۵) ابن ماجہ، القزوینی: السنن، ابواب الفتن، ص۲۸۳، اشرفی بک ڈپو، دیوبند
(۴۶) الکہف:۲۷ (۴۷) المائدہ:۶۷
(۴۸) البقرہ:۱۲۰ (۴۹) الشوریٰ:۱۵
(۵۰) الکافرون:۱-۶ (۵۱) الحاقۃ:۴۴-۴۵

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۲۴)

(مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی کے افادات کی روشنی میں)

ڈاکٹر محی الدین غازی، ای میل:mohiuddin.ghazi@gmail.com

اس مضمون میں اس کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا اہم اور عظیم کام کرنے والوں کی تحسین میں کچھ رقم کیا جائے کہ اتنی عظیم خدمت مختلف شخصیات کے ذریعہ جس قدر ہمت واہتمام سے انجام دی گئی، وہ محتاج بیان وستائش نہیں ہے۔

پیش نظر تحریر میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا کام بہت ضروری مگر نازک عمل ہے، اس میں غلطی کے امکانات کو کم سے کم کرتے رہنے کی مسلسل کوشش ضروری ہے، قرآن اللہ کا کلام ہے، تاہم اس کلام کا ترجمہ ایک انسانی کوشش ہوتی ہے، جس میں غلطیوں کا امکان ہمیشہ باقی رہتا ہے، اسی لئے جو ترجمہ جتنا زیادہ مشہور ومتداول ہے اس کا بار بار گہرائی اور باریک بینی سے جائزہ لیتے رہنا بھی اسی قدر زیادہ ضروری ہے۔ اس جائزہ میں نہ کسی طرح کا احترام مانع ہونا چاہئے اور نہ کوئی نسبت حائل ہونی چاہئے، راقم کی رائے میں ہونا تو یہ چاہئے کہ ترجمہ قرآن کا کام اجتماعی طور پر اکیڈمی کی سطح پر اور متعدد بار متعدد ماہرین لغت کی نظر سے گذرنے کے بعد قابل اشاعت سمجھا جائے، اور اشاعت کے بعد بھی نظر ثانی کا کام جاری رہے۔ لیکن بوجوہ تراجم قرآن کے ساتھ ایسا اہتمام نہیں ہوسکا۔ عام طور سے ہر ترجمہ قرآن ایک انفرادی کوشش رہی ہے، اور اس لئے غلطیوں کا امکان کسی نہ کسی حد تک ہر ترجمہ میں پایا جاتا ہے۔

----

(۱۱۴) مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاًکا ترجمہ

قرآن مجید میں حنیفا کا لفظ دس بار آیا ہے،اس کے علاوہ حنیف کی جمع حنفاء کا بھی دو مرتبہ ذکر ہوا ہے۔ پانچ مقامات پر مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً آیا ہے،ان پانچوں مقامات پر ترجمہ کرتے ہوئے یہ سوال اٹھتا ہے کہ حنیفا اگر نحوی ترکیب کے لحاظ سے حال ہے تو اس کا ذوالحال کیا ہے،یعنی وہ کس کا حال ہے؟،کیونکہ اس کی وجہ سے ترجمہ مختلف ہوسکتا ہے۔ہم پہلے ان مقامات کے مختلف ترجمے پیش کریں گے، اوراس کے بعد ان ترجموں کے متعلق اپنا جائزہ پیش کریں گے۔

(۱) وَقَالُواْ كُونُواْ هُوداً أَوْ نَصَارَى تَهْتَدُواْ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ (البقرة:۱۳۵)

''یہودی کہتے ہیں: یہودی ہو تو راہ راست پاؤ گے عیسائی کہتے ہیں: عیسائی ہو،تو ہدایت ملے گی اِن سے کہو:''نہیں، بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیمؑ کا طریقہ اور ابراہیمؑ مشرکوں میں سے نہ تھا''۔(سید مودودی)

''یہ (یہودی و نصرانی) لوگ کہتے ہیں کہ تم لوگ یہودی ہوجاؤ یا نصرانی ہوجاؤ تم بھی راہ پر پڑ جاؤ گے،آپ کہہ دیجئے کہ ہم تو ملت ابراہیمی (یعنی اسلام) پر رہیں گے جس میں کجی کا نام نہیں اور ابراہیم علیہ السلام مشرک بھی نہ تھے''(اشرف علی تھانوی)

''اور کتابی بولے یہودی یا نصرانی ہوجاؤ راہ پاؤ گے تم فرماؤ بلکہ ہم تو ابراہیمؑ کا دین لیتے ہیں جو ہر باطل سے جدا تھے اور مشرکوں سے نہ تھے–(احمد رضا خان)

اور (یہودی اور عیسائی) کہتے ہیں کہ یہودی یا عیسائی ہوجاؤ تو سیدھے رستے پر لگ جاؤ۔(اے پیغمبران سے) کہہ دو،(نہیں) بلکہ (ہم) دین ابراہیم (اختیار کیے ہوئے ہیں) جو ایک خدا کے ہو رہے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے''(فتح محمد جالندھری)

''یہ کہتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔تم کہو بلکہ صحیح راہ پر ملت ابراہیمی والے ہیں،اور ابراہیم خالص اللہ کے پرستار تھے اور مشرک نہ تھے''(جوناگڑھی)

(۲) قُلْ صَدَقَ اللّهُ فَاتَّبِعُواْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ (آل عمران: ۹۵)

''کہو، اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے سچ فرمایا ہے،تم کو یکسو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقہ کی پیروی کرنی

چاہیے، اور ابراہیمؑ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا‘‘ (سید مودودی)

’’آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالی نے سچ کہہ دیا سو تم ملت ابراہیم کا اتباع کرو جس میں ذرا کجی نہیں اور وہ مشرک نہ تھے‘‘ (اشرف علی تھانوی)

’’کہہ دو کہ خدا نے سچ فرمادیا پس دین ابراہیم کی پیروی کرو جو سب سے بے تعلق ہو کر ایک (خدا) کے ہو رہے تھے اور مشرکوں سے نہ تھے‘‘ (فتح محمد جالندھری)

(۳) وَمَنْ أَحْسَنُ دِيناً مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لله وَهُوَ مُحْسِنٌ واتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً وَاتَّخَذَ اللّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلاً۔ (النساء:۱۲۵)

’’اُس شخص سے بہتر اور کس کا طریق زندگی ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور اپنا رویہ نیک رکھا اور یکسو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کی، اُس ابراہیمؑ کے طریقے کی جسے اللہ نے اپنا دوست بنالیا تھا‘‘ (سید مودودی)

’’اور اس شخص سے زیادہ اچھا کس کا دین ہوگا جو کہ اپنا رخ اللہ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو۔ اور وہ ملت ابراہیم کا اتباع کرے جس میں کجی کا نام نہیں، اور اللہ تعالی نے ابراہیم کو اپنا خاص دوست بنایا تھا‘‘ (اشرف علی تھانوی)

’’باعتبار دین کے اس سے اچھا کون ہے؟ جو اپنے کو اللہ کے تابع کر دے اور ہو بھی نیکو کار، ساتھ ہی یکسوئی والے ابراہیم کے دین کی پیروی کر رہا ہو اور ابراہیم (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے اپنا دوست بنا لیا ہے‘‘ (محمد جوناگڑھی)

(۴) قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ دِيناً قِيَماً مِّلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ (الانعام:۱۶۱)

’’اے محمدؐ! کہو میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں، ابراہیمؑ کا طریقہ جسے یکسو ہو کر اُس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا‘‘ (سید مودودی)

’’آپ کہہ دیجئے کہ مجھ کو میرے رب نے ایک سیدھا رستہ بتلا دیا ہے کہ وہ ایک دین ہے مستحکم طریقہ ہے ابراہیم کا جس میں ذرا کجی نہیں اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے‘‘ (اشرف علی تھانوی)

(۵) ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِين۔ (النحل:۱۲۳)

''پھر ہم نے تمہاری طرف یہ وحی بھیجی کہ یک سو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقے پر چلو اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا'' (سید مودودی)

''پھر ہم نے تمہیں وحی بھیجی کہ دین ابراہیم کی پیروی کرو جو ہر باطل سے الگ تھا اور مشرک نہ تھا'' (احمد رضا خان)

''پھر ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی کہ آپ ابراہیم کے طریقہ پر جو کہ بالکل ایک طرف کے ہو رہے تھے چلیئے اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے'' (اشرف علی تھانوی)

(۶) مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيّاً وَلاَ نَصْرَانِيّاً وَلَكِن كَانَ حَنِيفاً مُّسْلِماً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ (آل عمران: ۶۷)

''ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ عیسائی، بلکہ وہ ایک مسلم یکسو تھا اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا'' (سید مودودی)

(۷) إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضَ حَنِيفاً وَمَا أَنَاْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ (الانعام: ۷۹)

''میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اُس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں'' (سید مودودی)

(۸) وَأَنْ أَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفاً وَلاَ تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ (یونس: ۱۰۵)

''اور مجھ سے فرمایا گیا ہے کہ تو یکسو ہو کر اپنے آپ کو ٹھیک ٹھیک اِس دین پر قائم کر دے، اور ہرگز ہرگز مشرکوں میں سے نہ ہو'' (سید مودودی)

''اور یہ کہ اپنے آپ کو اس دین (مذکور توحید خالص) کی طرف اس طرح متوجہ رکھنا کہ اور سب طریقوں سے علیحدہ ہو جاؤ'' (اشرف علی تھانوی)

(۹) إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتاً لِلّهِ حَنِيفاً وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ (النحل: ۱۲۰)

''واقعہ یہ ہے کہ ابراہیمؑ اپنی ذات سے ایک پوری امت تھا، اللہ کا مطیع فرمان اور یک سو وہ کبھی مشرک نہ تھا'' (سید مودودی)

(۱۰) فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفاً ۔ (الروم: ۳۰)

''پس (اے نبیؐ، اور نبیؐ کے پیروؤں) یک سو ہو کر اپنا رُخ اِس دین کی سمت میں جما دو'' (سید مودودی)

''سوتم یک سوہو کر اپنا رخ اس دین کی طرف رکھو'' (اشرف علی تھانوی)

(۱۱) وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاء۔ (البیّنۃ: ۵)

''اور اُن کو اِس کے سوا کوئی علم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین کو اُس کے لیے خالص کر کے، بالکل یکسو ہو کر'' (سید مودودی)

مذکورہ بالا آیتوں اور ان کے مختلف ترجموں کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں اور خاص طور سے جب ہم مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً کے ترجموں پر غور کرتے ہیں، تو صورت حال کچھ اس طرح سامنے آتی ہے۔

عام طور سے مترجمین نے حنیفا کو ابراهیم سے حال مان کر ترجمہ کیا ہے، ''ابراہیم جو یکسو تھا''۔ بہت کم اردو مترجمین نے کوئی دوسری راہ اختیار کی ہے۔ عام ترجمے سے ہٹ کر ترجمہ کرنے والے دو نام خاص طور سے سامنے آتے ہیں۔ مولانا تھانوی اور مولانا مودودی۔

مولانا تھانوی نے حنیفا کو ملة کا حال بنایا ہے، ''ابراہیم کا طریقہ جس میں کوئی کجی نہیں ہے''۔

مولانا مودودی نے مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً کا ترجمہ کرتے ہوئے حنیفا کو نہ ملة کا حال بنایا ہے، اور نہ ابراهیم کا حال بنایا ہے، بلکہ اس سے پہلے مذکور ضمیر کا حال بنا کر ترجمہ کیا ہے'' یکسو ہو کر پیروی کرو ابراہیم کے طریقے کی''۔

اس طرح گویا تین طرح کے مفہوم سامنے آتے ہیں، ابراہیم حنیف تھے، ابراہیم کا طریقہ حنیف تھا، اور ابراہیم کے طریقے کی پیروی کرنے والے کو حنیف ہونا ہے۔

تینوں میں سے کون سا ترجمہ زیادہ بہتر ہے اس پر گفتگو سے پہلے یہ اشارہ بھی مفید ہوگا کہ مولانا تھانوی نے مذکورہ پانچوں مقامات میں سے سورہ نحل والی آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے عام مترجمین کی راہ اختیار کر لی۔ جبکہ مولانا مودودی نے پانچوں مقامات میں سے سورہ انعام والی آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے عام مترجمین والا ترجمہ کر دیا۔

مولانا تھانوی کے مطابق مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً میں حنیفا کو ملة کا حال بنانے سے ایک اشکال تو یہ سامنے آتا ہے کہ قرآن مجید میں ابراهیم کو تو صریح طور سے حنیف کہا گیا ہے، إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتاً لِلّهِ حَنِيفاً، اسی طرح کہیں پر ان لوگوں کو بھی صریح طور سے حنفاء کہا گیا ہے جنہیں دین پر چلنے کی ہدایت دی گئی، وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاء، لیکن کہیں دین کے لیے یا ابراہیم کے طریقے کے لیے صریح طور سے حنیف کی صفت کا استعمال نہیں ہوا ہے۔ ایسی صورت میں قرآن کی تفسیر قرآن سے کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں احتمال پایا جاتا ہو وہاں اس صورت کو اختیار کیا

جائے جس کی صریح اور قطعی نظیر قرآن مجید میں موجود ہو، یعنی زیر نظر مقامات پر حنیف کو ملة کے بجائے ابراھیم کی صفت قرار دیا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ملة مونث ہے اور حنیفا مذکر ہے، اس لیے ملة اور ابـراھیم یعنی مذکر اور مونث جب دونوں موجود ہوں، اور دونوں میں ذوالحال بننے کا احتمال پایا جاتا ہو وہاں پہلے درجے میں حنیفا کو مذکر یعنی ابراھیم کا حال بنانا چاہیے۔

مولانا مودودی کے ترجمہ کے مطابق پہلے مذکور ضمیر کو ذوالحال بنانے کی صورت میں ایک اشکال یہ سامنے آتا ہے کہ سورہ آل عمران والی آیت میں فاتبعوا آیا ہے، یعنی اس فعل میں فاعل ضمیر واحد نہیں بلکہ ضمیر جمع ہے، ایسی صورت میں اگر وہ ضمیر ذوالحال ہوتی تو حنیفا کی جگہ حنفاءہوتا جیسا کہ قرآن مجید میں دوسرے دو مقامات پر جمع ذوالحال کے لیے حـنـفـاءآیا ہے۔ غالبا مولانا مودودی کا ذہن اس طرف نہیں جاسکا اور انہوں نے غلطی سے اس آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے فـاتبعوا میں موجود جمع کی ضمیر کو حـنیفا کا ذوالحال بنادیا۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ جمہور مترجمین نے حـنیفا کو ابراھیم کا حال مانا ہے، یہی بات زیادہ مناسب ہے، اس رائے کے حق میں قرآنی استعمالات کی ایک زبردست دلیل حـنیـفـا کے بعد و مـا کـان من الـمشـر کین والا جملہ ہے، وہ اس طرح کہ اوپر مذکور دوسری جن آیتوں میں ابـراھیم کا ذکر نہیں ہے اور حـنیفا کا لفظ آیا ہے وہاں حـنیفا کے ذوالحال کی رعایت سے حـنیفا کے بعد والا جملہ آیا ہے، جیسے و لا تکونن من المشرکین اور و ما أنا من المشرکین۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جہاں و ما کان من الـمشرکین آیا ہے وہاں حـنیفا کا ذوالحال وہی ہے جس کی ضمیر و ما کان کا اسم ہے، یعنی ابراہیم۔ غرض حنیفا کے بعد والے جملے میں جس کا ذکر ہے اسی کو حنیفا کا ذوالحال ہونا چاہیے۔

مذکورہ بالا سورہ روم والی آیت میں زمخشری کا خیال ہے کہ حـنیفا کو الدین کا حال بنایا جاسکتا ہے، لیکن اس کی تردید سورہ بینہ والی آیت سے ہوتی ہے جہاں حـنفـاءآیا ہے جو یقینی طور پر الدین کا حال نہیں ہے۔ قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ مولانا تھانوی جو دوسرے مقامات پر حـنیفا کو ملة کا حال بناتے ہیں، وہ بھی سورہ روم والی آیت میں حنیفا کو الدین کا حال نہیں بناتے، اس سے بھی اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا والی آیتوں میں حنیفا کو ملة کا حال نہیں بلکہ ابراھیم کا حال ہونا چاہیے۔

غرض تمام قرآنی نظائر اور استعمالات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ جمہور مترجمین نے جو ترجمہ کیا ہے وہی قرآنی استعمالات کے زیادہ موافق ہے۔

افادات جلیل احسن ندویؒ (۲)

ظفر احمد الاثری، لندن، ای میل:asarizafar@hotmail.com

دعوت الی اللہ کی فکر کو اجاگر کرنا

مولانا جلیل احسن ندویؒ کی قرآنی فکر کو سمجھنے کے لیے ان کی تمام تحریروں کا مطالعہ کرنا از بس ضروری ہے، بغیر ان کا مطالعہ کیے ان کی فکر کو نہیں سمجھا جا سکتا، آیئے ان کی تحریروں کی روشنی میں ان کی قرآنی فکر کا مطالعہ کیا جائے۔

مولانا کے نزدیک دعوت اسلامی اور توحید کا مفہوم

توحید ثلث دین ہے، رسالت و معاد، توحید کے تحت آتے ہیں۔ اور تمام انبیاء نے اپنی دعوت توحید سے شروع کی، مولانا حدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت پیش کرتے ہیں:

''معاویہ بن حیدہ قشیری اپنے اسلام لانے کا قصہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچا، میں نے پوچھا:'' آپ کو ہمارے رب نے کیا پیغام دے کر بھیجا ہے اور آپ کیا دین لائے ہیں''؟ آپ نے فرمایا:''خدا نے مجھے دین اسلام دے کر بھیجا ہے''۔

میں نے پوچھا:''دین اسلام کیا ہے؟'' حضور ﷺ نے جواب دیا:''اسلام یہ ہے کہ تم اپنی پوری ذات کو اللہ کے حوالے کر دو اور دوسرے معبودوں سے دست کش ہو جاؤ۔ اور نماز قائم کرو اور زکوۃ دو''۔

مولانا اس کی تشریح یوں کرتے ہیں:''یہ مکی دورِ دعوت کا واقعہ ہے جس میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ اپنے آپ کو، اپنے جسم و جان کو، اپنی ساری قوتوں اور صلاحیتوں کو، غرض اپنی ہر چیز کو اللہ کے حوالے کر دینے کا نام اسلام ہے۔ توحید کا یہی مفہوم ہے۔ یہ تو مثبت پہلو ہوا۔

اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو، اپنے جسم و جان کو، اپنی قوتوں اور اپنی صلاحیتوں کو، غرض اپنی پوری زندگی کو دوسروں کے حوالے کرنے سے انکار کرے۔۔ دوسروں سے بےتعلق ہو جائے، دوسرے لوگوں کو کسی بھی پہلو سے ذرا بھی شریک نہ کرے۔ دوسرں لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اپنی کسی چیز کو اپنی نہ جانے بلکہ خدا کی امانت سمجھے۔ ہر چیز کو خدا کے حوالے کر چکنے کے بعد اگر اس کی مرضی کے خلاف

استعمال کرتا ہے تو اپنے عہد حوالگی میں سچا نہیں ہے۔

دوسری بات اس حدیث سے یہ معلوم ہوئی کہ نماز اور زکوۃ (انفاق) مکی دور دعوت میں فرض ہو چکی تھیں، البتہ تفصیلات بعد میں دی گئیں''۔(۱)

مولانا کے نزدیک کلمہ توحید کی دعوت سیاسی نظام پر منتج ہوتی ہے

کلمہ توحید صرف کلمہ نہیں بلکہ اس نظام توحید کی بنیاد ہے اور جب یہ کلمہ قریش کے لوگوں نے سنا تو ان کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ سمجھ گئے کہ اس کے اثرات زندگی کے کن کن حصوں میں پڑنے جا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے یہ بھی سمجھ لیا کہ ہمارے جاہلی تصورات پر ایک ضرب کاری ہے جسے کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتے۔ پھر اسی کا نتیجہ تھا کہ اس کی مخالفت اس شدت سے ہوئی جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کو مان لینے کی صورت میں پورا خطہ عرب ان کے آگے سرنگوں ہو جائے گا اور اس کلمہ کی بدولت پورا ملک عرب دست نگر ہو جائے گا۔ مولانا ایک حدیث پیش کرتے ہیں ملاحظہ ہو:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا سے کہا: ''اے چچا میں لوگوں سے صرف ایک کلمہ کا مطالبہ کرتا ہوں، وہ کلمہ ایسا ہے اگر یہ لوگ مان لیں تو پورا ملک عرب اس کلمہ کی بدولت ان کے ماتحت آ جائے گا، اور غیر عرب قومیں ان کو جزیہ دیں گی''۔ لوگ نبی ﷺ کی یہ بات سن کر چونک اٹھے۔ انہوں نے کہا: ''تم ایک کلمہ کا مطالبہ کرتے ہو، تمہارے باپ کی قسم! ہم دسیوں باتیں ماننے کے لیے تیار ہیں۔ بتاؤ وہ کلمہ کیا ہے''۔ ابو طالب نے بھی کہا: ''اے بھتیجے وہ کلمہ بتاؤ کیا ہے؟'' نبی ﷺ نے فرمایا: ''وہ کلمہ 'لا الہ الا اللہ' ہے''۔

اس حدیث کی تشریح مولانا کرتے ہیں: ''یہ حدیث بھی مکی دورِ دعوت سے تعلق رکھتی ہے، کلمہ توحید لا الہ الا اللہ محض ایک کلمہ نہیں ہے بلکہ اس سے پورا نظام توحید مراد ہے جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے، اور صرف نماز روزہ ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ اس بنیاد پر سیاسی نظام قائم کرنا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو نبی ﷺ اس کا فائدہ کیوں کر بتلاتے کہ عرب زیر اقتدار آ جائیں گے اور غیر عرب قومیں جزیہ دیں گی۔ کیا بغیر سیاسی اقتدار حاصل کیے یہ بات کسی طرح کل ممکن تھی یا آج ممکن ہے یا آئندہ کبھی ممکن ہوگی؟ یہ آپ کی گفتگو اس وقت ہوئی جب قریشی لیڈر اپنے سب سے بڑے سردار ابو طالب کے پاس شکایت کرنے آئے اور یہ سمجھ کر شکایت کرنے آئے تھے کہ ابو طالب اپنا ذاتی اور سیاسی دباؤ ڈال کر اس دعوت کو بند کرا دیں گے۔ ایسے ہی ایک موقع پر اپنے چچا ابو طالب سے نبی ﷺ نے فرمایا: ''اے چچا! اگر میرے دائیں ہاتھ میں سورج دے دیا جائے اور بائیں ہاتھ میں چاند، جب بھی 'ما ترکت هذا الأمر حتى يظهره الله أو أهلك في طلبه''۔ یعنی میں اپنی دعوت بند نہیں کر سکتا یہاں تک کہ اللہ تعالی اس کو

غالب کردے یا میں اسی حالت میں مر جاؤں۔‘‘

سوال یہ ہے کہ اظہار دین کا کیا مطلب ہے؟ قرآن مجید میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے وہاں سیاسی غلبہ مراد ہے(ملاحظہ ہو سورہ فتح، آیت نمبر ۲۸، سورہ صف آیت نمبر ۹، سورہ توبہ آیت نمبر ۳۳)(۲)
(آیتوں کا ترجمہ)(۳)

مولانا کے نزدیک دعوت عباداتی نظام تک محدود نہیں ہے بلکہ دنیا و آخرت کی سعادت مطلوب ہے

اسلام کی دعوت میں دنیا و آخرت کی کامیابیاں پنہاں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اسلام کی دعوت سے بس ’’کچھ نیک لوگ تیار ہو جائیں اور دعوت کا مقصد پورا ہو جائے، نہیں، بلکہ اس دعوت سے مقصود یہ ہے کہ اس سے دنیا کی سعادت و آخرت کی کامیابی مل جائے‘‘۔ اس حقیقت کی تشریح مولانا اس حدیث سے کرتے ہیں:

’’عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے۔۔۔ رسول اللہ ﷺ نے قریشی مشرک لیڈروں کی بات سن کر فرمایا: ’’مجھے قطعاً حرص نہیں ہے اس چیز کی جو تم پیش کر رہے ہو، میں جو دعوت تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں اس کا یہ مقصد قطعاً نہیں ہے کہ میں مال جمع کرنا چاہتا ہوں یا شرف وعزت کا طالب ہوں یا تم پر حکومت یا اقتدار کا بھوکا ہوں، بلکہ اللہ تعالی نے مجھے تمہارے پاس اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے اور مجھ کو اپنی کتاب سے نوازا ہے۔ اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہارے غلط نظام زندگی کے عواقب اور نتائج سے آگاہ کروں اور اس دعوت کے قبول کرنے کے نتیجے میں جو کچھ ملنے والا ہے اس کی خوشخبری دوں، تو میں نے اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا (اور پہنچا رہا ہوں) اور تمہاری خیر خواہی پہلے بھی پیش نظر تھی اور آج بھی۔ اگر تم لوگ اب بھی میری دعوت کو اپنا لو تو یہ دنیا اور آخرت دونوں میں تمہاری خوش نصیبی ہوگی‘‘۔

مولانا اس حدیث کی تشریح کرتے ہیں: ’’یہ حدیث بھی مکی دور دعوت سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا آخری جملہ قابل غور ہے، اگر نبی ﷺ کی دعوت صرف عباداتی نظام تک محدود تھی اور زندگی کے جملہ مسائل اور معاملات سے بحث نہیں کرتی اور صرف آخرت بنانے کے لیے تھی تو آخرت کے ساتھ یہ دنیا کا جوڑ کیسا؟ دونوں کی خوش نصیبی کس پہلو سے؟ کیا صرف اس پہلو سے کہ کچھ نیک قسم کے لوگ تیار ہو جائیں؟ نہیں، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ کچھ اور بھی ہے، وہ پوری زندگی سے بحث کرتی ہے اور دنیا کی سعادت اور آخرت کی ابدی کامیابی کی ضمانت دیتی ہے‘‘(۴)

ہمہ گیر دعوت اور زندگی کے تمام شعبوں پر محیط

دوسری حدیث سے وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ دعوت، ہمہ گیر دعوت ہے، اس کا تعلق صرف چند

انفرادی چیزوں سے نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق ہے۔اور یہ دعوت ایسی نہیں کہ لوگ ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرلیں بلکہ اس میں سخت مزاحمت پیش آئے گی، اور یہ خدائی اصولوں کی دعوت ہے، ملاحظہ ہو یہ حدیث:

''حضرت علی بن ابی طالبؓ سے روایت ہے۔۔۔مفروق بن عمرو بن شیبانی نے نبیﷺ سے پوچھا: ''اے قریشی آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں''، تو نبیﷺ اس کی طرف بڑھے اور فرمایا: ''میں تم لوگوں کو اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ تم لوگ گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں اور اس بات کی کہ میں اللہ کا رسول ہوں''۔

مفروق نے آپ سے پوچھا: ''اے قریشی، آپ اور کس چیز کی دعوت دیتے ہیں''؟ تو رسول اللہ ﷺ نے ''قل تعالوا اتل ما حرم ربکم سے لعلکم تتقون تک کی آیتیں پڑھ کر سنائیں۔اس پر مفروق نے کہا: ''اور کس چیز کی طرف آپ دعوت دیتے ہیں''؟ تو آپ نے ان اللہ یامر بالعدل (۵) کی پوری آیت سنائی۔تو مفروق نے کہا: ''بخدا اے قریشی تم نے اونچے درجے کی اخلاقیات اور بہترین اعمال کی دعوت دی''۔

اس حدیث کی تشریح مولانا کرتے ہیں: ''یہ واقعہ مکی دور دعوت کا ہے۔حج کے زمانہ میں آپ کا معمول تھا کہ آپ اکیلے یا ابوبکرؓ اور علیؓ کے ساتھ ہر ہر قبیلے کی قیام گاہ پر جاتے اور انہیں اسلام کی دعوت دیتے۔کسی سال حج کے زمانہ میں قبیلہ شیبان کے لوگ آئے ہوئے تھے، تو آپ حضرت علیؓ اور ابوبکرؓ کے ساتھ اس قبیلے کے سرداروں کے پاس گئے۔انہی سرداروں میں سے ایک سردار کا نام مفروق ہے جو حضرت ابوبکر سے واقف تھا اور انہی کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ابتدائی گفتگو انہی دونوں کے درمیان ہوئی۔ ابوبکرؓ نے مفروق اور دوسرے لوگوں سے نبیﷺ کا تعارف کرایا۔انہیں بتایا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں جن کا ذکر تم نے سنا ہوگا۔ان لوگوں نے کہا کہ ہاں ہم نے ان کا چرچا سنا ہے۔اس کے بعد وہ نبیﷺ کی طرف مخاطب ہوا اور پوچھا: آپ کی دعوت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں آپ نے سورہ انعام کی آیت ۱۵۱ تا ۱۵۳(۶) پڑھ کر سنائیں۔ان میں خالص توحید اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔نیز غریبی کی وجہ سے قتل اولاد کی ممانعت کی گئی ہے، کھلی یا چھپی بدکاری سے روکا گیا ہے۔آگے چل کر یتیم کے مال کو ہڑپ کرنے اور ناپ تول میں کمی کرنے سے منع کیا گیا ہے اور یہ کہ کوئی بات کہو تو انصاف کے ساتھ کہو، چاہے اس کی زد رشتہ دار پر پڑتی ہو اور اللہ کے عہد بندگی کو پورا کرو''۔

دیکھیے سورہ انعام مکی دور کی سورہ ہے۔اس میں دین کی بنیادی تعلیم سمٹ کر آگئی ہے اور صرف عبادت ہی پر گفتگو نہیں کی گئی ہے بلکہ جاہلی نظام کی خرابیوں پر تنقید کی گئی ہے۔انہیں بتایا گیا ہے کہ اسلامی

معاشرہ کن بنیادوں پر قائم ہو کہ انسانیت ہر طرح کے امن واطمینان اور خیر وسعادت سے ہمکنار ہو۔اگر اسلامی دعوت محض عبادات تک محدود ہوتی تو یہ تمام بنیادی اصول کیوں بیان کیے جاتے؟ درآنحالیکہ بعد میں قائم ہونے والا صالح سیاسی نظام انہی بنیادوں پر قائم ہوا ہے، یہی اصول مزید تفصیلات کے ساتھ سورہ بنی اسرائیل کے تیسرے رکوع میں بیان ہوئے ہیں اور یہ بھی مکی سورہ ہے(۷)۔دوسری آیت سورہ نحل میں آئی ہے وہ بھی مکی سورہ ہے(آیت:۹۰)(۸)اس میں بھی اسلام کی پوری دعوت نہایت جامع انداز میں بیان کردی گئی ہے۔

مفروق بن عمرو شیبانی نے جب پوری دعوت سن لی تو اس نے اس موقع پر بھی کہا تھا: لعل هذا الامر الذی تدعو الیه تکرهه الملوك (یہ دعوت جو آپ دے رہے ہیں شاید بادشاہوں کو پسند نہیں آئے گی)

سوال یہ ہے اگر اپنی انفرادی حیثیت میں چند اصولوں کو برتنے کی دعوت ہے اور انسانی زندگی کے جملہ شعبوں سے تعرض نہیں کرتی اور زمین کے پورے سیاسی نظام کو اپنی بنیادوں پر نہیں قائم کرتی تو ملوک و ارباب اقتدار کیوں خفا ہوں گے۔معلوم ہوا کہ یہ دعوت اتنی سادہ قسم کی نہیں ہے۔یہ تو زندگی کے پورے نظام کو از سر نو الٰہی اور خدائی اصولوں پر قائم کرنے کی دعوت ہے۔‘‘(۹)

ان احادیث کی روشنی میں جو تشریح مولانا نے پیش کی ہے، اس سے دین کا کامل تصور سامنے آتا ہے۔اسی تصور اور اسی فکر کو مولانا پیش کرتے ہیں۔مولانا دعوت اسلامی کو سیاسی نظام سے جوڑتے ہیں۔ان کی رائے میں دعوت اسلامی کا منتہائے مقصود، سیاسی نظام کا قیام ہے ورنہ ان ساری عبادتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ان کی رائے میں دعوت دین کا مقصود دین کا غلبہ ہے، وہ کلمہ توحید کو ایک کلمہ نہیں کہتے ہیں بلکہ یہ پوری انسانی زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔مولانا کی رائے میں چند عبادتوں کے قیام سے دین قائم نہیں ہو سکتا بلکہ پورے سیاسی نظام کی ضرورت ہے جسے مودودیؒ اپنی تفسیر سورہ شوریٰ میں اس طرح لکھتے ہیں:’’انبیاء علیہم السلام کو جب اس دین کے قائم کرنے اور قائم رکھنے کا حکم دیا گیا تو اس سے مراد صرف اتنی ہی بات نہ تھی کہ وہ خود اس دین پر عمل کریں اور اتنی بات بھی نہ تھی کہ وہ دوسروں میں اس کی تبلیغ کریں تا کہ اس کا برحق ہونا تسلیم کر لیں، بلکہ یہ بھی تھی کہ جب لوگ اسے تسلیم کر لیں تو اس سے آگے قدم بڑھا کر پورا کا پورا دین ان پر عملاً رائج اور نافذ کیا جائے تا کہ اس کے مطابق عملدرآمد ہونے لگے اور ہوتا رہے۔اس میں شک نہیں کہ دعوت وتبلیغ اس کام کا لازمی ابتدائی مرحلہ ہے جس کے بغیر دوسرا مرحلہ پیش نہیں آسکتا، لیکن ہر صاحب عقل آدمی خود دیکھ سکتا ہے کہ اس حکم میں دعوت وتبلیغ کو مقصود کی حیثیت نہیں دی گئی ہے، بلکہ دین قائم کرنے اور قائم رکھنے کو مقصود قرار دیا گیا ہے۔دعوت وتبلیغ اس مقصود کے حصول کا ذریعہ ضرور ہے مگر

بجائے خود مقصود نہیں ہے کجا کہ کوئی اسے انبیاء کے مشن کا مقصود وحید قرار دے بیٹھے‘‘۔(۱۰)

ان باتوں کو پیش کرنے سے مقصود یہ ہے کہ مولانا جلیل احسن ندویؒ ایک طرف فکر فراہیؒ سے مستفید ہو رہے تھے تو دوسری طرف فکر مودودیؒ کو اپنے اندر سموئے تھے، گویا وہ مجمع البحرین تھے اور ان باتوں سے سے طلبہ کو مستفید کرتے رہتے تھے۔

مولانا کے درس کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ تحریکی ذہن کے حامل افراد کی تیاری میں منہمک تھے اور درس کے دوران دعوت الی اللہ کی فکر کو طلبہ کے ذہن میں سمونے اور اس راستہ پر ڈالنے کی کوشش کرتے تھے، آپ نے پہلی قسط میں پڑھا ہوگا کہ انھوں نے پورے قرآن کا جو تجزیاتی گروپ بنایا ہے اس سے واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہوں نے دعوت الی اللہ کے پہلو کو بہت نمایاں طور پر اجاگر کیا ہے۔ جیسے وہ کہتے ہیں کہ ’’ہر گروپ میں دعوت اسلامی کی ابتدا اور اس کی انتہا کا بیان ہے‘‘۔ اسی طرح توحید کے گروپ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ’’سبا تا حجرات میں توحید اور اس کے لوازم اور اس کے مقتضیات‘‘ ہیں اور آخرت کے گروپ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ’’ق تا تحریم بعث، حشر ونشر اور اس کے متعلقات‘‘ ہیں۔ اور رسالت کے گروپ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ’’فرقان تا احزاب، نبوت اور رسالت اور اس کے خصائص وامتیازات‘‘ بیان ہوئے ہیں۔ مولانا کی یہ تقسیم بہت واضح طور پر بتلاتی ہے عقیدہ کی تین بنیادیں جو دین میں اساس کی حیثیت رکھتی ہیں ان کے بغیر کسی معاشرہ کی تعمیر نہیں ہوسکتی، اور انہیں مولانا اسلامی معاشرہ کی تعمیر کے لیے اساس قرار دیتے ہیں۔ اور یہ مکی سورتوں کی خصوصیات ہیں:

مکی سورتوں کی خصوصیات

۱۔ عقیدہ کی ترسیخ، توحید، رسالت، آخرت۔

۲۔ عدل وقسط پر مبنی معاشرہ کے لیے ضرری ہے کہ توحید، معاد اور رسالت پر ایمان لایا جائے۔

۳۔ ان تینوں پر ایمان لائے بغیر اسلامی معاشرہ کی تعمیر نہیں ہوسکتی۔

مکی سورتیں کا نزول جب شروع ہوا تو ان بنیادی باتوں کی طرف خصوصی توجہ دی گئی جن سے اسلامی معاشرہ کی تعمیر ہوسکے، توحید، آخرت، اور رسالت کی طرف بھرپور طریقے سے توجہ دی گئی اور ہر پیرائے اور ہر اسلوب میں مخاطب کے ذہنوں میں ان باتوں کو ڈالنے کی کوشش کی گئی اور ان کے دلائل دیئے گئے ہیں اور انہیں دلوں میں راسخ کر دیا گیا تا کہ اسلامی معاشرہ کی تعمیر میں وہ اساس کا کام کریں. مولانا سورہ نور کی ابتدائی تفسیر میں فرماتے ہیں:

’’اس سورہ کا مرکزی مضمون قیام قسط ہے، اس میں وہ چیزیں بیان ہوئی ہیں جو اسلامی معاشرہ کو خرابیوں سے پاک کرنے والی ہیں اور عدل وقسط کی شاہراہ پر چلانے والی ہیں، بہت سی مکی سورتوں کے

بعد اس مدنی سورہ کا لانا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مکی سورتوں میں توحید، معاد اور رسالت پر جو گفتگو کی گئی ہے تو کوئی معاشرہ جب تک ان تینوں بنیادوں کو اپنی بنیاد نہ قرار دے اس وقت تک کسی صالح یا بہتر سوسائٹی کا تصور نہیں کیا جا سکتا پس اسلامی معاشرہ کے لیے ان تینوں عقیدوں پر ایمان لانا ضروری ہے اور مزید یہ احکام ہیں جو اس سورہ (نور) میں دیئے جا رہے ہیں۔ یاد ہوگا سورہ مؤمنون کے شروع میں ''المومنون'' کو فلاح کی بشارت دی گئی، پھر مومنین کے اوصاف بیان ہوئے گویا یہ انہی ابتدائی آیتوں کی تشریح ہے''۔

مولانا مودودیؒ اور دعوت اسلامی کی بنیادیں

مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ نے بھی اپنی تفسیر قرآن میں دعوت الی اللہ کے پہلو کو بہت واضح طور پر بیان کیا ہے اور اسے اپنی تفسیر کا موضوع بنایا ہے، اور اس پر زور دینے کی کوشش کی ہے کہ دعوت الی اللہ کا پہلو قاری کے ذہن میں نمایاں ہو کر ابھرے، انھوں نے اپنی شہرہ آفاق تفسیر تفہیم القرآن میں جگہ جگہ مکی اور مدنی سورتوں کی خصوصیات بیان کی ہیں، دین کی یہ تین بنیادیں عقیدہ آخرت، عقیدہ توحید، عقیدہ رسالت مکی دور میں بار بار اور مختلف انداز سے بیان کی گئی ہیں، وہ لکھتے ہیں: ''مکہ معظّمہ میں جب اوّل اوّل رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا تو اس کی بنیاد تین چیزیں تھیں، ایک یہ بات کہ اللہ کے ساتھ کسی کو خدائی میں شریک نہ مانا جائے، دوسری یہ کہ آپ کو اللہ نے اپنا رسول مقرر کیا ہے، تیسری یہ کہ اس دنیا کا ایک روز خاتمہ ہو جائے گا، اور اس کے بعد ایک دوسرا عالم برپا ہوگا جس میں تمام اولین و آخرین دوبارہ زندہ کر کے اسی جسم کے ساتھ اٹھائے جائیں گے جس میں رہ کر انہوں نے دنیا میں کام کیا تھا، پھر ان کے عقائد اور اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ اور اس محاسبہ میں جو لوگ مومن و صالح ثابت ہوں گے وہ ہمیشہ کے لیے جنت میں جائیں گے اور جو کافر و فاسق ہوں گے وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔(۱۱)

اس طرح مولانا مودودیؒ اور مولانا جلیل احسن ندویؒ کے نزدیک دعوت اسلامی کی تبلیغ و اشاعت کے اپروچ میں مکمل فکری یکسانیت موجود ہے۔

توحید کے اثبات کے ذریعہ اثبات قیامت

مولانا جلیل احسن ندویؒ سورہ سبا کے بارے میں فرماتے ہیں؛ ''سورہ سبا کا مرکزی مضمون اثبات قیامت ہے اور اس کو ثابت کرنے کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے توحید کا اثبات کیا ہے اور اس سے اثبات جزا اور قیامت پر استدلال کیا گیا ہے، دلائل کی نوعیت یہ ہے کہ خدا ہی آسمان و زمین کا خالق ہے اور ہر چیز کا مالک ہے، یہاں کسی اور کے اقتدار اور فرماں روائی کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ انسان کو جتنی نعمتیں ملی ہیں وہ سب اس کی عطا کردہ ہیں، تو جب خالق، مالک، مقتدر اور منعم صرف وہ ہے تو بندوں

کے لیے ضروری ہے کہ صرف اس کے شکرگزار رہوں، زبان سے بھی، دل سے بھی اور اعضاء وجوارح سے بھی، یعنی صرف اسی کو مرکز محبت بنائیں اور زبان سے صرف اسی کا ذکر کریں اور اعضاء وجوارح کے ذریعہ صرف اسی کی اطاعت کریں اور اس ہمہ گیر شکر کو دوسرے لفظوں میں توحید کہا جاتا ہے اور جب وہ خالق ہے تو اس کی بنائی ہوئی دنیا بے مقصد نہیں ہو سکتی اور جب وہ مقتدر ہے اور حکیم ہے تو وہ لازماً حساب بھی لے گا اور غداروں اور وفاداروں میں فرق کرے گا''۔

دعوت کو جھٹلانے پر تنبیہی عذاب اور اللہ کی سنت

اللہ کے رسولوں کے باب میں سنت یہ رہی ہے، جس کا قرآن مجید میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے، کہ اللہ کے رسولوں کی دعوت بالعموم پانچ مراحل میں منقسم ہوتی ہے۔ دعوت، انذار، اتمام حجت، ہجرت، اور برأت (۱۲)۔ جب یہ مراحل پورے ہو جاتے ہیں اور شہادت قائم ہو جاتی ہے تو اللہ تعالی رسولوں کو غلبہ نصیب کرتا ہے اور منکرین کو عذاب دیتا ہے۔ دعوت اور اس کے مراحل کے بارے میں قرآن کی آیتوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے (۱۳) اور انبیائی دعوتوں کی کتنی قسمیں ہیں اس کا مطالعہ بھی از بس ضروری ہے (۱۴)۔

دعوت کے مسلسل انکار کے نتیجے میں اللہ تعالی اپنے تنبیہی عذاب کا سلسلہ شروع کر دیتا ہے۔ اس تنبیہی عذاب کا ذکر سورہ دخان کی آیت ۱۰/ فارتقب یوم تأتی السماء بدخان مبین ''تو اس دن کا انتظار کرو جبکہ آسمان سے صریح دھواں نکلے گا'' میں مذکور ہے اور سورہ دخان کا موضوع کفار کے لیے انذار ہے اور مومنین کے لیے فتح کی بشارت ہے اور اس میں توحید اور دعوت کا ذکر ہے۔

مولانا جلیل احسن ندویؒ (بدخان مبین) کی تشریح میں فرماتے ہیں: ''اس میں اس بات کا ذکر ہے کہ قرآن کا نزول انسانی زندگی میں شادابی کا سبب بنتا ہے۔ اس سے نوع انسانی کے اندر بہار آتی ہے۔ انسانوں کے دل کھیتی کی طرح ہیں جو بنجر بھی ہوتے ہیں اور شادابی والے بھی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالی قرآن نازل فرما کر اس وحی کی بارش سے صالح قلوب والوں کے دلوں میں زندگی پیدا کر دیتا ہے اور یقیناً جو اسے قبول نہیں کرتے ان کو آخرت میں ذلت اور ناکامی سے دوچار ہونا پڑے گا اور وہ دنیوی عذاب سے بھی دوچار ہوں گے''۔ اس کے بعد مولانا اللہ کی اس سنت کا ذکر کرتے ہیں جو ہر رسول کے ساتھ پیش آئی ہے۔

وہ ''فارتقب یوم تأتی السماء بدخان مبین '' کی تشریح میں کہتے ہیں: ''انبیاء کرام جس قوم اور جس دور میں مبعوث ہوتے ہیں وہ دور نہایت خوشحالی کا دور ہوتا ہے، دولت کی ریل پیل ہوتی ہے، ان کی زندگیوں میں نعمتوں کی بارش ہوتی ہے، پھر وہ تکبر اور غرور میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ایسی صورت میں نبی کی دعوت کو نہیں سنتے اور اسے ٹھکرا دیتے ہیں، اور دوسری طرف اپنی باطل دلیل سے عوام کو بھڑکاتے

رہتے ہیں تا کہ وہ گمراہی کے راستہ میں گامزن رہیں، ایسے میں ان پر اللہ کی طرف سے تنبیہی عذاب مسلط کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہی صورتحال نبیﷺ کے ساتھ پیش آئی، اس وقت قریش اقتدار کے نشہ میں چور تھے ان کے پاس دولت کی بھر مار تھی اور اللہ کی سنت کے مطابق انھوں نے رسول کی دعوت کو جھٹلانا شروع کر دیا، یہاں تک کہ پانی سر سے اونچا ہو گیا تو آپ نے بد دعا دی کہ [اے اللہ] انھیں قحط سالی میں مبتلا کر جس طرح حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں لوگ مبتلا ہوئے تھے، چنانچہ دعا بارگاہ الٰہی میں مقبول ہوئی اور یہ قحط سالی دو سال تک مسلط رہی اور جب قحط سالی اپنے عروج پر پہنچ گئی اور لوگ بھوک کے مارے آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو صرف دھواں دھواں ہی نظر آتا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، چنانچہ قریش کے بڑے بڑے سردار حضور کے پاس آئے اور کہا: اے محمد! تم قحط سالی کو دور کرو، شاید تمہاری تکذیب سے یہ ہوا ہے، جب یہ دور ہو گیا تو قریش کے سرداروں نے یہ ہتھیار استعمال کیا کہ یہ دور تو ہمارے آباء کو بھی آیا کرتے تھے، یہ کوئی نبی کی تکذیب کا نتیجہ نہیں، یہ دلیل عوام کو بھڑکانے کے لیے جادو بن کر پھیل گئی۔ مصیبت ٹل جانے بعد پھر قریش کے لوگ اپنی حالت کی طرف لوٹ گئے۔ جس طرح آیت میں ''انکم عائدون'' سورہ دخان آیت ۱۵ ؍ میں مذکور ہے۔ جب عذاب ٹل جاتا ہے تو قوم کو پہلے کی بہ نسبت اور دولت ملنے لگتی ہے، اس میں مزید اضافہ ہونے لگتا ہے جو اللہ کی سنت ہے، تا کہ مزید آزمائش ہو سکے اور وہ نبی کی تکذیب زیادہ شد و مد سے کرنی شروع کر دیں۔ (۱۵)

اس مرحلہ کے بعد ہجرت کا حکم ہو جاتا ہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اس کے بعد ہجرت کا حکم آ گیا اور تمام لوگ ہجرت کر گئے۔ ہاں دوسرے دور میں وہ نبی کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں اور قتل کرنے کے فیصلہ کے بعد ہی ہجرت کا حکم آتا ہے۔ ہجرت کے بعداب ان پر عذاب کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، رُکتا نہیں، چنانچہ یہ قحط سالی کے بعد سب سے بڑا عذاب جنگ بدر تھا، جسے ''یوم نبطش البطشة الکبری'' (سورہ دخان آیت ۱۶) کہا گیا ہے اور اس سے غزوۂ بدر مراد ہے۔ یہ دھمکی قحط سالی کے آنے سے پہلے سنائی گئی لیکن وہ پھر بھی نہ سنبھل سکے، چنانچہ اللہ کی سنت کے مطابق جنگ احزاب تک مشرکین کے پاؤں اکھڑ گئے اور حضور نے فرمادیا کہ یہ مشرکین جنگ کا اقدام نہیں کر سکتے، اگر کریں گے تو ہم ہی کریں گے، دراصل ان آیتوں میں اللہ تعالی اپنی سنت بیان کر رہا ہے''۔ (یہ مولانا کی وضاحت ہے جو انھوں نے درس کے دوران پیش کی)

ان سے جو باتیں مترشح ہوتی ہیں وہ یہ ہیں:

قرآن میں جو دعوت کے مراحل کا ذکر ہے اور قوموں سے برأت کا ذکر ہے، یہ رسولوں کے ساتھ

خاص ہے، اور ہجرت کے لیے اتمام حجت لازمی شرط ہے اور یہ بھی رسولوں کے ساتھ خاص ہے، اسی طرح کسی داعی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کے لیے عذاب کی بددعا کرے، یہ بھی نبی کے لیے خاص ہے کہ وہ قوم کو عذاب کی وعید سنائے۔

مولانا مودودیؒ بھی اس آیت'' بدخان مبین '' سے مراد قحط سالی لیتے ہیں اور اس سلسلہ میں ایک حدیث نقل کرتے ہیں: '' حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مشہور شاگرد مسروق کہتے ہیں کہ ایک روز ہم کوفے کی مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک واعظ لوگوں کے سامنے تقریر کررہا تھا۔ یہ آیت بدخان مبین پڑھی، پھر کہنے لگا، جانتے ہو یہ کیسا دھواں ہے؟ یہ دھواں قیامت کے روز آئے گا اور کفار و منافقین کو اندھا بہرا کردے گا، مگر اہل ایمان پر اس کا اثر بس اس قدر ہوگا کہ جیسے زکام لاحق ہوگیا ہو، اس کی یہ بات سن کر ہم عبداللہ بن مسعود کے پاس گئے اور ان سے واعظ کی یہ تفسیر بیان کی۔ حضرت عبداللہ لیٹے ہوئے تھے۔ یہ تفسیر سن کر گھبرا کے اٹھ بیٹھے اور کہنے لگے کہ جس آدمی کو علم نہ ہو اسے جاننے والوں سے پوچھ لینا چاہیے، اصل بات یہ ہے کہ جب قریش کے لوگ اسلام قبول کرنے سے انکار اور رسول ﷺ کی مخالفت کرتے چلے گئے تو حضور نے دعا کی کہ خدایا یوسف علیہ السلام کے قحط جیسے قحط سے میری مدد فرما۔ چنانچہ ایسا شدید کال پڑا کہ لوگ ہڈیاں اور چمڑا اور مردار تک کھا گئے۔ اس زمانہ میں حالت یہ تھی کہ جو شخص آسمان کی طرف دیکھتا تھا، اسے بھوک کی شدت میں دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا۔ آخر کار ابوسفیان نے آکر حضور سے کہا کہ آپ تو صلہ رحمی کی دعوت دیتے ہیں۔ آپ کی قوم بھوکوں مر رہی ہے۔ اللہ سے دعا کیجیے کہ اس مصیبت کو دور کردے۔ یہی زمانہ تھا جب قریش کے لوگ کہنے لگے تھے کہ خدایا ہم پر سے یہ عذاب دور کردے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ اسی واقعہ کا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے، اور بڑی ضرب سے مراد جو آخر کار جنگ بدر کے روز قریش کو لگائی گئی۔ یہ روایت امام بخاری، ترمذی، نسائی، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے متعدد سندوں کے ساتھ مسروق سے نقل کی ہے۔'' (۱۶)

مولانا مودودیؒ اس کے بعد کہتے ہیں کہ '' بھوک کی شدت میں جب لوگ آسمان کی طرف دیکھتے تھے دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا، یہ بات قرآن کے ظاہر الفاظ سے مطابقت نہیں رکھتی اور احادیث کے بھی خلاف ہے۔'' (۱۷)

'' اور کہتے ہیں: '' اس بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ وہ قحط کے زمانہ کی چیز نہیں ہے بلکہ علامات قیامت میں سے ہے اور یہی بات احادیث سے بھی معلوم ہوتی ہے،'' (۱۸)

قرآن کی تفسیر احادیث سے

قرآن سے شغف کا یہ حال تھا کہ اپنے مجموعہ احادیث میں اس بات کی پوری رعایت کی کہ حدیث

کی تشریح کے وقت اگر اس کی اصل قرآن میں موجود ہے تو اس حدیث کی تشریح میں قرآن کی متعلقہ آیت کو بیان کرتے تھے، چونکہ احادیث قرآن کی تفسیر بیان کرتی ہیں۔ اسی حقیقت کو امام ابن تیمیہؒ یوں کہتے ہیں کہ ''کسی آیت کی تفسیر میں مشکل پیش آئے تو سنت کی طرف رجوع کیا جائے اس لیے کہ سنتِ رسول قرآن کی تشریح وتفسیر بیان کرتی ہے''۔

عام طور سے شروح احادیث میں اس بات کی جگہ بہت کم ہے یا نہیں ملتی ہے کہ احادیث کی تشریح قرآن کی روشنی میں کی جائے۔ یہ مولانا کا امتیاز تھا جو ان کے مجموعہ احادیث میں نظر آتا ہے، یہ مولاناؒ کی ایک بہت بڑی خصوصیت اور ان کا امتیازی وصف تھا۔ ملاحظہ ہو یہ حدیث:

''حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں، نبی ﷺ جنگ بدر کے موقعہ پر تین سو پندرہ صحابہ کو ساتھ لے کر نکلے، اس موقعہ پر آپ ﷺ نے یہ دعا کی کہ اے اللہ یہ پیدل چل رہے ہیں ان کو سواری دے، اے اللہ ان کے جسم پر کپڑے نہیں ہیں انھیں کپڑے پہنا، اے اللہ یہ لوگ بھوکے ہیں انھیں پیٹ بھر کھانا کھلا، تو (نبی کی دعا کی برکت سے) اللہ نے اہل ایمان کو فتح سے نوازا اور وہ اس حال میں مدینہ لوٹے کہ ہر ایک کے پاس ایک دو اونٹ تھے اور ہر ایک کو لباس اور غذائی سامان مہیا تھا''۔

اس کی تشریح قرآن کے حوالہ سے کرتے ہیں: ''یہ انعام کی پہلی قسط تھی جو بدر میں ملی تھی اور پھر ملتی رہی اور آخرت میں جو انعام ملنے والا ہے اس کا اندازہ اس دنیا میں رہتے ہوئے کیونکر کیا جا سکتا ہے، ان کے رب نے تبوک کے آخری سخت امتحان میں پاس ہونے کے بعد سورہ توبہ آیت (۱۱۱) میں فرمایا جس کا توضیحی ترجمہ یہ ہے: ''یقیناً اللہ نے مومنین سے ان کی جان اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے (کیونکہ یہ اپنی بیع میں سچے ثابت ہوئے، ہر امتحان میں کامیاب ہوئے، دیکھو جان سے پیاری کوئی چیز نہیں ہوتی اور یہ لوگ برسوں سے اپنی جان ہتھیلیوں پر لیے) دین کے دشمنوں سے لڑتے رہے، مارتے بھی رہے اور مرتے بھی رہے (لیکن پیچھے نہیں ہٹے) ان سے جنت کا وعدہ پکا وعدہ ہے، جسے پورا کرنا اللہ نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے، اس وعدہ کا ذکر تورات میں بھی ہے، انجیل میں بھی ہے اور قرآن میں بھی ہے اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے۔ پس اے اہل ایمان خوش ہو جاؤ اپنی جان اور مال کی بیع پر کہ خریدار نے جنت کے عوض خرید لیا ہے، اب بیع مکمل ہوئی۔'' (سفینہ نجات ص ۲۸۵۔۲۸۶)

ایک اور حدیث کی تشریح میں ''مال یتیم میں کفیل کا حق'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''ایک آدمی حضور ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا، ''میں محتاج ہوں، میرے پاس کچھ نہیں ہے اور میری سرپرستی میں ایک (صاحب جائداد) یتیم ہے (تو کیا میں اس کے مال میں سے کھا سکتا ہوں)''۔

آپ نے فرمایا،''ہاں تم اپنے یتیم کے مال میں سے کھا سکتے ہو، بشرطیکہ اسراف نہ کرو اور جلد بازی سے کام نہ لو اور اپنی جائداد بنانے کی فکر نہ کرو''یعنی اگر کسی یتیم کا سرپرست مالدار ہے تو اس کو قرآن کی ہدایت کے مطابق کچھ نہ لینا چاہیے، لیکن اگر وہ غریب ہے اور یتیم صاحب جائداد ہے تو یہ اس کے مال کی حفاظت کرے گا، اور اس کو بڑھانے کی کوشش کرے گا اور اس میں سے اپنا خرچ لے لے گا، لیکن اس کے لیے جائز نہیں کہ اس کے مال کو اس کے جوان ہونے سے پہلے جلدی جلدی ہضم کر جائے۔ نیز وہ یتیم کے مال سے اپنی جائداد نہیں بنا سکتا۔ خدا سے نہ ڈرنے والے بے ایمان لوگ یتیموں کے مال کو ہوشیاری کے ساتھ اپنی جائداد بنا لیتے ہیں یا اس کے بڑے ہونے سے پہلے اس کی پوری جائداد کو کھا پی کر اُڑا دیتے ہیں۔

سورہ نساء میں اللہ تعالی نے یتیموں کے مال کے سلسلہ میں ہدایت دی ہے، جو اس حدیث میں بیان ہوئی ہے۔ فرمایا: و لا تأکلو ھا اسرافا و بدارا۔۔۔(النساء، آیت:۶)''اور یتیموں کے مال نہ کھاؤ فضول خرچی کے ساتھ اور جلدی کرتے ہوئے، ان کے بڑے ہونے کے ڈر سے اور جو مالدار ہو تو اس کو چاہیے کہ یتیم کا مال کھانے سے بہت بچے اور جو غریب ہو تو اس کو یتیم کے مال میں سے دستور کے مطابق کھانا چاہیے۔''(راہ عمل، ص:۱۶۱۔۱۶۲)

حواشی و تعلیقات:

(۱) زادراہ، ازمولانا جلیل احسن ندویؒ، ص:۱۶۰۔۱۶۱

(۲) زادراہ، ازمولانا جلیل احسن ندویؒ، ص:۱۶۱۔۱۶۲

(۳) ترجمہ:''وہی ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ تاکہ اس کو غالب کرے سارے دینوں پر اور اللہ کی گواہی کافی ہے''(سورہ فتح:۲۸)

ترجمہ:''وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ اس کو غالب کرے تمام دینوں پر اگر چہ مشرکین کو کتنا ہی ناگوار ہو''(سورہ صف:۹)

ترجمہ:''وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے کہ اس کو سارے دین پر غالب کر دے ان مشرکوں کے علی الرغم''(سورہ توبہ:۳۳)

(۴) زادراہ، ازمولانا جلیل احسن ندویؒ، ص:۱۶۲۔۱۶۳

(۵) ترجمہ:''بیشک اللہ حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا، اور ذوی القربی کو دیتے رہنے کا، اور روکتا ہے بے حیائی، برائی اور سرکشی سے، وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔''(سورہ نحل:۹۰)

(۶) ترجمہ:''کہو، آؤ میں سناؤں جو چیزیں تم پر تمہارے رب نے حرام کی ہیں، وہ یہ ہے کہ تم کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو، اور اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے

قتل نہ کرو، ہم تم کو بھی روزی دیتے ہیں اوران کو بھی، اور بے حیائی کے کاموں کے پاس نہ پھٹکو، خواہ ظاہر ہو یا پوشیدہ۔ اور جس جان کو اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے اس کو قتل نہ کرو مگر حق پر، یہ باتیں ہیں جن کی خدا نے تمھیں ہدایت فرمائی ہے تا کہ تم سمجھو اور یتیم کے مال کے پاس نہ پھٹکو بجز اس طریقے کے جو اس کے لیے بہتر ہو، یہاں تک کہ وہ سن رشد کو پہنچ جائے اور ناپ تول انصاف کے ساتھ پوری رکھو۔ ہم کسی جان پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔ اور جب تم بولو تو عدل کی بات بولو، خواہ کوئی تمہارا قرابت دار ہی ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ یہ چیزیں ہیں جن کی اس نے تمھیں ہدایت فرمائی تا کہ یاددہانی حاصل کرو اور یہ کہ یہی میرا راستہ سیدھا راستہ ہے تو اس کی پیروی کرو اور دوسری پگڈنڈیوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اس کی راہ سے الگ کر دیں، یہ باتیں ہیں جن کی تمھیں ہدایت فرمائی تا کہ اس کے غضب سے بچو۔'' (سورہ انعام: ۱۵۱۔۱۵۳)

(۷) ترجمہ: ''اور تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرو، اگر وہ تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، ان میں سے ایک یا دونوں، تو نہ ان کو اُف کہو اور نہ جھڑکو اور ان سے شریفانہ بات کہو، اور ان کے لیے رحمدلانہ اطاعت کے بازو جھکائے رکھو اور دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب ان پر رحم فرما، جیسا کہ انھوں نے بچپن میں مجھے پالا۔ تمہارا رب جو تمہارے دلوں میں ہے اس سے خوب واقف ہے۔ اگر تم سعادت مند رہو گے تو وہ رجوع کرنے والے کو بڑا بخشنے والا ہے۔ اور تم قرابت دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو بھی اور مال کو اللے تللے نہ اڑاؤ۔ اَللّے تَللّے اڑانے والے شیطان کے بھائی ہوتے ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔ اور اگر تمہیں اپنے رب کے فضل کے انتظار میں، جس کے تم متوقع ہو، ان سے اعراض کرنا پڑ جائے تو تم ان سے نرمی کی بات کہہ دو۔ اور نہ تو اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے باندھے رکھو اور نہ اس کو بالکل کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ رہو۔ بیشک تمہارا رب ہی ہے جو رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، بے شک وہی اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا اور ان کو دیکھنے والا ہے۔ اور تم اپنی اولاد کو ناداری کے اندیشہ سے قتل نہ کرو، ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی، بے شک ان کا قتل بہت بڑا جرم ہے۔ اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو، کیونکہ یہ کھلی ہوئی بے حیائی اور نہایت بری راہ ہے اور جس جان کو خدا نے محترم ٹھہرایا ہے، اس کو قتل مت کرو مگر حق پر اور جو ظلماً قتل کیا گیا تو ہم نے اس کے ولی کو اختیار دیا، تو وہ قتل میں حدود سے تجاوز نہ کرے کیونکہ اس کی مدد کی گئی ہے۔ اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ پھٹکو مگر اس طریقہ سے جو اس کے حق میں بہتر ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے سن پختگی کو پہنچ جائے، اور عہد کو پورا کرو کیونکہ عہد کی پرسش ہونی ہے اور جب تم ناپو تو ناپ پوری رکھو

اور وزن صحیح ترازو سے کرو۔ یہی بہتر اور مآل کار کے اعتبار سے خوب تر ہے اور جس چیز کا تمہیں علم نہیں اس کے درپے نہ ہوا کرو۔ کیونکہ کان، آنکھ اور دل، ان میں سے ہر ایک چیز کی پرسش ہونی ہے۔ اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو، نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کے طول کو پہنچ سکتے ہو۔ ان ساری باتوں کی برائی تمہارے رب کے نزدیک نہایت ناپسندیدہ ہے''۔ (سورہ بنی اسرائیل: ۲۳۔۳۸)

(۸) ترجمہ: ''بیشک اللہ حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا، اور ذوی القربی کو دیتے رہنے کا اور روکتا ہے بے حیائی، برائی اور سرکشی سے، وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو''۔ (سورہ نحل ۹۰)

(۹) زادراہ، از مولانا جلیل احسن ندویؒ، ص: ۱۶۵۔۱۶۷

(۱۰) تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورہ شوری، حاشیہ: ۲۰)

(۱۱) تفہیم القرآن، جلد اول، سورہ النبأ، ص: ۲۲۰)

(۱۲) دعوت کے مراحل کے بارے میں مزید دیکھیں: تفسیر سورہ کافرون، امام حمیدالدین فراہیؒ

(الف) [قوموں کے مواخذہ کا قانون] سورہ شمس، امام حمیدالدین فراہیؒ۔

(ب) [احتساب سنت الٰہی] سورہ تحریم، امام حمیدالدین فراہیؒ

(ت) [قوموں کے مواخذہ کا قانون] سورہ شمس امام حمیدالدین فراہیؒ

(ث) امام فراہیؒ اپنی کتاب ''القائد الی عیون العقائد'' میں کہتے ہیں: ''نبی کو دعوت کے راستہ میں جو مصائب آتے ہیں صبر کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا، یہاں تک کہ وہ اپنی قوم کے لوگوں سے مایوس ہو جاتا ہے کہ اب مان کر نہیں دیں گے تو اس صورتحال میں یا تو جس قوم میں اس کی بعثت ہوئی ہے وہاں سے ہجرت کر جاتا ہے یا پھر ان کے پاس وہ غالب ہو کر لوٹتا ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ہوا، جب ان کی قوم ان کے بھتیجے حضرت لوطؑ پر حملہ آور ہوئی تو انہیں شکست ہوئی، اسی طرح یہ سنت نبی ﷺ کے ساتھ پیش آئی جب آپ نے مکہ کو فتح کیا لیکن نبی جس شہر کو ہجرت کے بعد چھوڑ دیتا ہے وہاں دوبارہ لوٹ کر نہیں جاتا اسی لیے حضرت ابراہیمؑ نے جہاں ہجرت کی، وہیں آپ نے اپنا مسکن بنایا اور یہی صورتحال ہمارے نبیؐ کے ساتھ پیش آئی۔ مکہ فتح کیا لیکن وہاں سکونت نہیں اختیار کی، مدینہ واپس چلے گئے۔ رسول کی بعثت جس قوم میں ہوتی ہے اگر وہاں سے وہ ہجرت کر جاتے ہیں، تو یا تو ان پر عذاب آجاتا ہے جیسے لوط، نوح، ھود، صالح، شعیب، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام کے ساتھ پیش آیا یا پھر رسول ہجرت نہیں کرتا ہے بلکہ اعلان جنگ کرتا ہے اور اپنی قوم سے تمام تعلقات کو توڑ لیتا ہے جیسا کہ ان کے بیانات میں ہم دیکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ابراہیمؑ اور ان کے حواریوں نے یہ بات کہی [''ہم تم سے اور ان سے جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو بالکل بری ہیں، ہم نے تمہارا انکار کیا اور ہمارے اور تمہارے مابین

ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بے زاری آشکارا ہوگئی، تا آنکہ تم اللہ وحدہ لاشریک لہ پر ایمان لے آؤ۔ مگر ابراہیم کی اپنے باپ سے اتنی بات کہ میں آپ کے لیے مغفرت مانگوں گا اگر چہ میں آپ کے لیے اللہ کی طرف سے کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ اے ہمارے رب، ہم نے تیرے اوپر بھروسہ کیا اور تیری طرف رجوع ہوئے اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔ اے ہمارے رب، ہم کو ان لوگوں کا تختۂ مشق نہ بننے دینا جنھوں نے کفر کیا اور اے ہمارے رب ہم کو بخش، بے شک تو عزیز وحکیم ہے''۔ سورہ ممتحنہ: ۴۔۵]

(القائد الی عیون العقائد، امام حمید الدین فراہی، ص: ۱۵۹، ایضا: فی ملکوت اللہ، امام فراہی، ص: ۴۴)

قرآن میں اللہ کے سنن کا ذکر سورہ کہف، آیت: ۹۵۔۸۵، (اور مہلت کے بعد گرفت) کا ذکر سورہ انعام آیت: ۴۵۔۴۴ میں اور اسی سورہ کی آیت: ۴۵ میں ہے، اور اسی طرح سورہ ہود آیت: ۱۵ میں ہے۔

امام فراہیؒ کہتے ہیں کہ ''آزمائشیں دو قسم کی ہیں ایک عمومی اور ایک خصوصی۔ عمومی آزمائش کا ذکر سورہ ملک آیت: ۲، اور سورہ مائدہ آیت ۴۸ میں ہے۔ اور خصوصی آزمائش کا ذکر سورہ عنکبوت آیت: ۳۔۲ میں ہے''۔ (فی ملکوت اللہ، امام فراہیؒ ص: ۳۷۔۳۶)

(ج) مولانا امین احسن اصلاحیؒ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ ''ہر دعوت کو کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے ان تینوں مرحلوں (مراد دعوت، ہجرت، جنگ) سے گزرنا لازمی نہیں ہے، مقصود صرف یہ ہے کہ عام طور پر یہ تینوں مرحلے پیش آتے ہیں ورنہ جمہوریت میں اس بات کا بھی امکان ہے صرف پہلا مرحلہ ہی دعوت کو کامیابی سے ہم کنار کر دے''۔

اس موضوع پر مزید گفتگو مولانا صدر الدین اصلاحیؒ نے اپنی کتاب ''تحریک اسلامی ہند'' میں کی ہے، انھوں نے انبیاء کرام کی دعوتوں کو بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے اور موجودہ دور میں اور موجودہ سسٹم میں اس کے انطباق پر بہت ہی مفید باتیں تحریر کی ہیں اور اپنی قرآنی بصیرت کی روشنی میں تحریک اسلامی کے لیے لائحہ عمل پیش کیا ہے کہ کیسے موجودہ نظام میں دعوت اسلامی کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ اور اس دور کے نظام کو سامنے رکھتے ہوئے دینی مصالح کی روشنی میں دعوت اسلامی کو انجام دینے کا پروگرام بھی بتلایا ہے، کہ کس طرح موجودہ نظام میں رہتے ہوئے انبیائی طریقہ کار کو اپنایا جا سکتا ہے۔ مولانا نے اس کو ہم آہنگ کرنے کی بہترین کوشش کی ہے، اور انبیائی دعوت کی روشنی میں تمام باتوں کو سامنے رکھ کر بنیادی خطوط مرتب کیے ہیں۔

ایک طویل تجزیہ اور بحث کے بعد کہ اس ملک میں تحریک کے دعوتی کام کا نقشہ کیا ہو، وہ کہتے ہیں کہ ''اپنے نقشہ کار کے اندر جہاں ان سارے نکات کو جگہ دی ہے جو تمام انبیائی دعوتوں کے مشترکہ نکات تھے، وہیں ان نکتوں کو بھی اختیار کیا ہے جو مختلف دعوتوں نے اپنی ان مخصوص حیثیتوں کے پیش نظر اختیار کر

رکھے تھے جن میں وہ ان سے مشابہت رکھتی ہے۔اس طرح اس کا جونقشہ کار مرتب ہوا ہے اس کے بنیادی خطوط حسب ذیل ہیں:''

ا۔''اصل پیغام کی اشاعت وتبلیغ'' ۲۔''نظام حاضر کی تنقید وتر دید''
۳۔''دلیل و برہان کی زبان'' ۴۔''موعظت حسنہ کا اہتمام''
۵۔''صاف گوئی'' ۶۔''دعوتی جدو جہد کی ذمہ داری ہر رکن پر''
۷۔''جماعتی نظم'' ۸۔''ارکان کی تربیت''
۹۔تنظیم کی صفائی ۱۰۔''اہم ملی مسائل پر توجہ''
۱۱۔''اہم ملکی مسائل پر نظر'' ۱۲۔''دوسری جماعتوں سے تعاون''
۱۳۔''مناسب وقت پر ملکی انتخاب میں شرکت''

مذکورہ بالا ان تمام عناوین کی تشریح کتاب میں موجود ہے۔(تحریک اسلامی ہند،ص:۱۹۸۔۲۰۷)

(۱۳) دعوت اوراس کے مراحل کے بارے میں قرآن کی ان آیتوں کا مطالعہ کیا جانا ضروری ہے:

(الف) سورہ بقرہ،آیت:۲۱۳،تدبر قرآن،جلد:۱:[رسولوں کی بعثت ہوئی۔انھوں نے آخرت کے برے انجام سے آگاہ کیا۔کفار ومنافقین کا استہزاء۔اپنے موقف پر جمے رہو۔آزمائش کا یہ دور ہے جواللہ کی سنت ہے]۔

(ب) سورہ نساء:۱۶۵،تدبر قرآن،جلد:۲،ص:۴۳۲:[رسولوں کے آنے بعد قوموں کے پاس کوئی عذر نہیں رہا۔انبیاء کا مشن،بشارت دینا اور خطرے سے آگاہ کرنا۔اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ سزا کسی کو دے تو اتمام حجت کے بعد۔]

(ت) سورہ روم:۱۳[نبی کی دعوت پر انذار اور مخالفت کے نتائج کا ذکر]

(ث) سورہ مومن:۸۲،۸۵،تدبر قرآن،جلد:۷،ص:۶۷[عذاب دیکھنے کے بعد ایمان بے سود ہے]

(ج) سورہ قلم:۳۸،تدبر قرآن،جلد:۸،ص:۵۲۶[صبر کے ساتھ دعوت پیش کرنے کی ہدایت مستکبرین کے مغالطہ کا جواب]

(ح) سورہ انفال:۳۳،۳۲،تدبر قرآن،جلد:۳[جب تک نبی موجود ہے عذاب نہیں آتا]

(خ) سورہ انعام آیت ۲۸۔۲۵،تدبر قرآن،جلد:۳،ص:۳۵۔۳۴[ایک سنت الٰہی کا ذکر، معنوی اور روحانی حجاب جو دل سننے اور سمجھنے سے محروم ہو جاتے ہیں]۔

(د) سورہ اعراف:۹۵۔۹۴،تدبر قرآن،جلد:۳،ص:۳۱۹۔۳۱۷[سنت الٰہی کا تفصیل سے ذکر

ہے، آفات میں اور آزمائشوں میں مبتلا کرتا ہے تاکہ لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں۔ مزید ذکر سورہ انعام آیات ۲۴۔۶۴، نیز سورہ اعرف: ۱۳۰ میں ہے]

(ذ) سورہ توبہ: ۷۔۶، تدبر قرآن، جلد: ۳، ص: ۵۴۰[اسلام قبول کرو یا تلوار، بنی اسرئیل کے لیے دو ہی آپشن تھے، ایک یہ کی دعوت کو قبول کرو ورنہ تمہیں بزور قوت زیر کر دیا جائے گا۔]

(ر) سورہ بنی اسرائیل، آیت: ۱۶، تدبر قرآن، جلد: ۴، ص: ۴۸۹:[عذاب الٰہی کا کا ذکر اور اس کی تشریح، حضرات انبیاءؑ نے اپنی دعوت میں سب سے پہلے اسی طبقہ کو خطاب کیا ہے، پھر جب اس طبقہ نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے نہ صرف ان کو مایوس کر دیا ہے بلکہ ان کے قتل کے در پے ہو گیا ہے تو نبی نے ہجرت فرمائی اور قوم عذاب الٰہی کی گرفت میں آ گئی]

(ز) سورہ ابراہیم: ۱۴،۱۳، تدبر قرآن، جلد: ۴[قوم نوٹس دیتی ہے اور وطن سے نکلنے کی دھمکی دیتی ہے تو اللہ کہتا ہے ہم ان کو ہلاک کر دیں گے۔]

(س) سورہ نحل: ۴۲، تدبر قرآن، جلد: ۴، ص: ۴۱۲۔۴۱۱[ہجرت کی حقیقت]

(ش) سورہ حج: ۴۱، تدبر قرآن، جلد: ۵، ص: ۲۵۸[مسلمانوں کے اقتدار کے ثمرات]

(ص) سورہ قصص: ۵۹، تدبر قرآن، جلد: ۵، ص: ۶۹۴[قوموں کی ہلاکت نبی کی بعثت کے بعد، اور یہی سنت الٰہی ہے۔ نبی کی تنبیہ اور انذار کے بعد۔]

(ض) سورہ محمد: ۴۰، تدبر قرآن، جلد: ۷، ص: ۳۹۹[اس سنت کا ذکر جس میں ایمان لانے والوں کی تعداد کم ہے تو ہجرت کا حکم ہوتا ہے، اور مکذبین کو ارضی یا سماوی عذاب۔ اگر ایمان لانے والوں کی تعداد زیادہ ہے تو جہاد کا حکم۔ نبی ﷺ کے ساتھ یہی ہوا۔]

(ط) سورہ محمد: ۷، تدبر قرآن، جلد: ۷، ص: ۳۹۸[بنی اسماعیل کے ساتھ خاص معاملہ رہا ہے ان کے لیے دو ہی راستے تھے اسلام قبول کرو یا یا جنگ۔ اس سنت کا تفصیل سے ذکر ہے۔ چونکہ ان کی طرف آپ کی بعثت براہ راست تھی]

(ظ) سورہ مجادلہ: ۲۱، تدبر قرآن، جلد: ۸، ص: ۲۷۳۔[یہ سنت ہے کہ غلبہ، اللہ اور اس کے رسولوں کو ہوگا۔]

(ع) سورہ شعراء: ۲۰۹۔۲۰۸، تدبر قرآن، جلد: ۵، ص: ۵۶۱[اللہ کی سنت عدل پر مبنی ہے بغیر اتمام حجت کے نہیں ہلاک کرتا۔]

(۱۴) انبیائی دعوتوں کی قسمیں، ''تحریک اسلامی ہند''، مصنف: مولانا صدالدین اصلاحیؒ، ص: ۱۷۵۔۲۰۷، میں موجود ہیں، ان عناوین کے تحت مطالعہ کیا جا سکتا ہے: [انبیاء کی مکمل پیروی،

انبیائی دعوتوں قسمیں]، [انبیائی دعوتوں کے نقشہ ہائے کار، اہل شرک وکفر کے درمیان]، [اہل کتاب وشریعت کے درمیان]، [بیک وقت اہل کفر و اہل کتاب دونوں گروہوں کے درمیان]، [نبی کریم آخرالزماں ﷺ کا نقشہ کار]، [تحریک اسلامی ہند کا نقشہ کار] ان کا مطالعہ بہت ہی مفید رہے گا۔اسی طرح اسی موضوع سے متعلق مولانا صدالدین اصلاحیؒ نے ''دین وسیاست'' کے عنوان سے ''اسلام ایک نظر میں'' میں طویل بحث کی ہے، اس ضمن اس فصل کا مطالعہ بہت مفید رہے گا۔ ذہن میں اٹھنے والے اشکالات اورسوالات کا جواب بھی ملے گا، اورانبیائی دعوت اوردین وسیاست کے رشتہ کو سمجھنے میں رہنمائی ملے گی۔

(۱۵) غالبًا اس آیت کی طرف اشارہ ہے: ''اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو ہم اس کے خوشحالوں کوامر کر دیتے ہیں تو وہ اس میں خوب اُودھم مچاتے ہیں۔ پس ان پر بات پوری ہوجاتی ہے پھر ہم اس کو یک قلم نیست و نابود کر کے رکھ دیتے ہیں'' سورہ بنی اسرئیل، آیت: ۱۶ کی تفسیر مولانا امین احسن اصلاحیؒ کرتے ہیں 'امر' صرف حکم دینے کے معنی میں نہیں آتا بلکہ بسا اوقات کسی کو ڈھیلا چھوڑ نے اورمہلت دے دینے کے مفہوم میں بھی آتا ہے، آپ کسی شخص کو یا گروہ سے افہام وتفہیم کی کوشش کرنے کے بعد جب تنگ آجاتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ 'افعلوا ما بدا لکم' جاؤ، جوتمہارے جی میں آئے کرو۔ بظاہر یہ امر ہی کا صیغہ ہوتا ہے لیکن اس کا مفہوم امہال ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالی بھی سرکش لوگوں پر اپنی حجت تمام کر چکنے کے بعد ان کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح سے بھر لیں۔

'مترفین' کسی قوم کے کھاتے پیتے خوش حال طبقہ کو کہتے ہیں۔ چونکہ قوم کی باگ انہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس وجہ سے سنت الٰہی یہ رہی ہے کہ ابراہیم علیہم السلام نے اپنی دعوت اصلاح میں سب سے پہلے اسی طبقہ کو خطاب کیا ہے، پھر جب اس طبقہ نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے نہ صرف ان کو مایوس کر دیا ہے بلکہ ان کے قتل کے درپے ہوگیا ہے تو نبی نے ہجرت فرمائی اور قوم عذاب الٰہی کی گرفت میں آگئی ہے۔ یہ عذاب کے معاملے میں سنت الٰہی کی مزید وضاحت ہے۔ فرمایا کہ جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوش حالوں کو ڈھیلا چھوڑ دیتے ہیں تو وہ اس میں خوب کھل کر خدا کی نافرمانیاں اور بدمستیاں کرتے ہیں تا آنکہ ان پر حجت تمام ہوجاتی ہے۔ اوران کا پیمانہ لبریز ہوجاتا ہے۔ پھر خدا ان کو پکڑتا ہے اوراس بستی کو تہ و بالا کر کے رکھ دیتا ہے۔ (تدبر قرآن، جلد:۴، ص:۴۸۹)

(۱۶) تفہیم القرآن، جلد:۴، حاشیہ:۱۳
(۱۷) تفہیم القرآن، جلد:۴، حاشیہ:۱۳
(۱۸) تفہیم القرآن، جلد:۴، حاشیہ:۱۳
(۱۹) سفینۂ نجات، ص:۲۸۵۔۲۸۶
(۲۰) راہ عمل، ص:۱۶۱۔۱۶۲

سید مودودیؒ کے تہذیبی افکار

ضمیر الحسن خاں فلاحی، علی گڑھ، موبائیل نمبر: 07417449612

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بڑی پیاری بات لکھی ہے کہ ''ہر مصنف امام وقت اور مجدد فن نہیں ہوتا، اس مقام کے لیے شرط ہے کہ مصنف نے کسی ایسے موضوع پر کوئی ایسی چیز پیش کی ہو جس سے اس وقت کا کتب خانہ خالی ہو، نئے نظریات، تازہ خیالات اور جدید تحقیقات پیش کی ہوں، اس کے یہاں جدت فکر اور ذہن کا اجتہاد ہو۔ اگر تنہا یہی شرط ہے تو امام ابن خلدون اس کی بہترین مثال ہیں۔ لیکن اگر فکر ارجمند کے ساتھ ''دل دردمند'' اور عقل کے ساتھ عشق جمع ہو جائے اور مصنف کا قلم نغمہ زن کی انگلی کی طرح رباب دل کے تاروں کے ساتھ کھیلنے لگے تو وہ صرف مصنف نہیں رہتا بلکہ ایک اخلاقی و دینی مصلح بھی بن جاتا ہے۔ امام غزالی اس کا شاندار نمونہ ہیں۔ اور اگر علم و استدلال کے ساتھ کوئی صحیح دینی تحریک دعوت، کوئی اصلاحی جوش اور کسی صالح انقلاب کی خواہش شامل ہو جائے اور اس کی تحریروں اور تصنیفات سے کسی نئے دور کا آغاز اور کسی نئی جماعت کی پیدائش کا سامان ہو تو وہ مجدد کہلانے کا مستحق ہے۔ امام ابن تیمیہ اور شیخ احمد سرہندی اس کی مثال ہیں۔ (شاہ ولی اللہ بحیثیت مصنف، الفرقان، خصوصی شمارہ، ص: ۳۸-۲۳۷)

مولانا ندوی کے اس اقتباس کا سیاق جو کچھ بھی ہو، لیکن اس کو سامنے رکھ کر اگر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریروں کا جائزہ لیا جائے تو یہ تمام خصوصیات ان کی تحریروں میں بہ کمال و تمام ملتی ہیں۔ مولانا کی تحریروں سے ایک نئے دور کا آغاز بھی ہوا اور ایک نئی جماعت کی تشکیل کا سامان بھی ہوا۔

سید مودودیؒ بیسویں صدی کے عظیم اسکالر، بہترین مفکر اور صاحب عزیمت داعی و قائد تھے۔ زبان و قلم کی خداداد صلاحیتوں سے بہرہ ور تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ انہوں نے اپنی ان خداداد صلاحیتوں کو خدا کے دین کی سربلندی اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے صرف کیا۔ مختلف النوع موضوعات پر قلم اٹھایا اور واقعہ یہ ہے کہ ہر موضوع کا حق ادا کیا۔

یوں تو اسلام اور تہذیبِ اسلامی پر اغیار کی طرف سے مختلف الجہات حملے کیے گئے مگر عصر جدید یا بیسویں صدی کا شاید سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار اور جارح مذہب ہے۔ اور افسوس یہ ہے کہ مسلمان اس قدر احساس کمتری اور ذہنی مرعوبیت میں مبتلا ہو چکے ہیں کہ جیسے ہی یہ الزام عائد کیا گیا، وہ فوراً مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہو گئے اور صفائیاں پیش کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا اور یہی ہونا چاہیے تھا کہ مغربی پروپیگنڈہ اور تیز ہو گیا۔ سید مودودیؒ نے اپنے مشن کا آغاز یہیں سے کیا اور اسلامی تہذیب کے رخ روشن کو اس بدنما داغ سے صاف کیا۔

اپنی پہلی اور شاہ کار تصنیف ''الجہاد فی الاسلام'' کے ذریعہ جہاد کی حقیقت سے دنیا کو آگاہ کیا نیز دوسرے مذاہب کے تصور جنگ پر بھی نہایت عالمانہ و فاضلانہ بحث کی۔ کتاب کے آخری باب ''جنگ اور تہذیب'' میں جنگ عظیم کا ذکر کر کے مغربی اقوام کی جارحیت پسندی اور خونخواریت کو بے نقاب کیا اور اہل مغرب کی خود غرضی، نفع خوری، کمزوروں کو ہڑپ کر جانا، دوسرے ملکوں کی معیشت کو تباہ کر کے محتاج بنانے وغیرہ کی پالیسی پر تاریخی حقائق کی روشنی میں بات کر کے تہذیب اسلامی کی برتری، بے لوثی، نفع خوری سے اجتناب، کمزوروں کی مدد وغیرہ کو ثابت کیا۔ (عمر حیات خان غوری۔ اقبال اور مودودی، ص: ۷۰، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔ ۱۹۸۱)

وطن عزیز ہندوستان میں آج جس طرح ہندتوا تہذیب کا غلغلہ سنائی دے رہا ہے، یہ کوئی نیا نعرہ نہیں ہے، آزادی سے پہلے غالباً ۱۹۳۲ء کے آس پاس ملک میں برملا کہا جانے لگا تھا کہ اس ملک میں مسلم تہذیب نام کی کسی تہذیب کا وجود نہیں، یہاں صرف ہندتو تہذیب ہے اور رہے گی، گویا اسی وقت سے مسلمانوں کی علیحدہ تہذیب کا انکار کر کے متحدہ قومیت کا نعرہ بلند کیا جا رہا ہے۔

مولانا مودودیؒ نے اس باطل نعرہ کا نوٹس لیا اور واضح کیا کہ تہذیب نسلی، ملکی یا قومی نہیں ہوتی، یہ انسان کو بحیثیت انسان خطاب کرتی ہے اور تمام انسانوں کو علم صحیح اور عمل صالح کے فیض میں شریک کرتی ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے پاس جو تہذیب ہے وہ تنہا مسلمانوں کی تہذیب نہیں ہے بلکہ ایک انسانی تہذیب ہے۔ (عمر حیات خان غوری، اقبال اور مودودی، ص: ۷۹، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۸۱)

مولانا کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ جب کسی موضوع پر سوچتے ہیں تو ایک طبیب حاذق کی طرح سب سے زیادہ زور اُن اسباب و علل پر صرف کرتے ہیں جن کی وجہ سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ سید مودودی نے ان اسباب کو تلاش کرنا شروع کیا جن کی وجہ سے مسلمان بالعموم احساس کمتری اور ذہنی مرعوبیت کی اس پستی میں گر چکے ہیں کہ انہیں آسان راستہ یہی نظر آ رہا ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن کا عکس

اپنی زندگی میں اُتار لیں۔ اس بحرانی کیفیت کا نقشہ مولانا نے اس طرح کھینچا ہے:

''یہی بحرانی کیفیت تھی جس میں مغربی لباس، معاشرت، مغربی عادات واطوار حتی کہ چال ڈھال اور بول چال تک میں مغربی طریقوں کی نقل اتاری گئی۔ مسلم سوسائٹی کو مغربی سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی، الحاد، دہریت اور مادہ پرستی کو فیشن کے طور پر بغیر سمجھے بوجھے قبول کرلیا گیا۔ ہر وہ پختہ یا خام تخیل جو مغرب سے آیا، اس پر ایمان بالغیب لانا اور اپنی مجلسوں میں اسے موضوع بحث بنانا روشن خیالی کا لازمہ سمجھا گیا۔ مغربی تہذیب کے ثمرات کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ شائستگی، اخلاق، معاشرت، معیشت، سیاست حتی کہ مذہبی عقائد اور عبادات کے متعلق بھی جتنے نظریات یا عملیات تھے ان کو کسی تنقید اور کسی فہم وتدبر کے بغیر اس طرح تسلیم کرلیا گیا گویا وہ آسمان سے اتری ہوئی وحی ہیں جس پر سمعنا و اطعنا کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اسلامی تاریخ کے واقعات، اسلامی شریعت کے احکام اور قرآن وحدیث کے بیانات میں سے جس جس چیز کو اسلام کے پرانے دشمنوں نے نفرت یا اعتراض کی نگاہ سے دیکھا، اس پر مسلمانوں کو شرم بھی آنے لگی اور انہوں نے کوشش کی کہ کس طرح اس داغ کو دھوڈالیں۔ انہوں نے جہاد پر اعتراض کیا، عرض کیا حضور بھلا ہم کہاں اور جہاد کہاں؟ انہوں نے غلامی پر اعتراض کیا، عرض کیا کہ غلامی تو ہمارے ہاں بالکل ہی ناجائز ہے۔ انہوں نے تعدد ازدواج پر اعتراض کیا، انہوں نے فوراً قرآن کی ایک آیت پر خطِ نسخ پھیر ڈالا۔

انہوں نے کہا کہ عورت اور مرد میں کامل مساوات ہونا چاہیے۔ انہوں نے عرض کیا کہ یہی ہمارا مذہب بھی ہے۔ انہوں نے قوانین نکاح وطلاق پر اعتراض کیا۔ یہ ان سب میں ترمیم کرنے پر تل گئے، انہوں نے کہا کہ اسلام آرٹ کا دشمن ہے، انہوں نے کہا کہ اسلام تو ہمیشہ سے ناچ گانے اور مصوری وبت تراشی کی سرپرستی کرتا رہا ہے۔'' (سید مودودی، پردہ، ص: ۲۹، ۲۸، مرکزی اسلامی پبلشرز، نئی دہلی۔۲۰۱۱ء)

اس طرح مولانا ان اسباب کا کھوج لگانے میں کامیاب ہوگئے جن کی وجہ سے امت متعدد ذہنی وفکری امراض میں مبتلا تھی۔ گندے پانی کے ان گڑھوں کی تلاش کے بغیر مرض کا علاج ممکن نہیں تھا۔ اس تلاش کے بعد ان کا کام آسان ہوگیا۔ مولانا نے پہلے ان گڑھوں میں جراثیم کش دوائیں ڈالیں اس کے بعد مرض کا علاج شروع کیا اور جب مریض کی حالت کچھ سدھرتی نظر آئی تو ایمان واسلام کو صحت مند بنانے میں لگ گئے اور پوری زندگی ان امراض کے علاج میں صرف کردی۔ پردہ، ضبط ولادت اور وقت کے کئی محاذوں پر چومکھی لڑائی شروع کردی اور پوری زندگی اسی کام میں لگے رہے۔

صنعتی انقلاب کے زمانہ میں جب مساوات مرد وزن اور آزادیٔ نسواں کا نعرہ لگایا گیا تو اس کی پہلی ضرب اسلامی معاشرت پر پڑی اور اسلامی تہذیب میں مرد وزن کے دائرہ کار کی تقسیم نیز اسلامی پردہ پر حملے کیے گئے اور اسے عورتوں پر ظلم عظیم سے موسوم کیا گیا۔

سید مودودی نے مغرب کے اس حملہ کا بھی بھرپور جواب دیا۔ اس ضمن میں مولانا نے پہلے مغربی تاریخ کا مطالعہ کر کے ان محرکات کی تلاش کی جن کی وجہ سے مساوات کا یہ رجحان مغرب میں شروع ہوا اور وہاں کے اہل علم ودانش کی آراء کا مطالعہ کر کے مغربی تہذیب پر اس کے اثرات جائزہ لیا تا کہ مغرب کو پہلے خود اپنے گریبان میں جھانکنے کا احساس ہو اور مسلمان ان کی اندھی تقلید سے بچ کر مغربی معاشرہ کے انجام سے واقف ہو جائیں۔ اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ''پردہ'' میں مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا اور معاشرہ کی تشکیل وتعمیر کے معاملہ میں مغرب کو اس کی بے راہ روی پر ٹوکا، خطرات کا آئینہ دکھایا اور معاشرہ کو صحیح خطوط پر استوار کرنے کی دعوت دی۔ (اقبال اور مودودی۔ حوالہ سابق، ص:۹۲)

کسی معاشرہ کی معیشت، تہذیب کی ایک اہم بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے، تہذیبوں کے باب میں دنیا نے مختلف معاشی نظاموں کا تجربہ کیا ہے اور ہر تجربہ ناکام اور معاشرہ کی بے چینی، اضطراب وانتشار کا ہی سبب بنا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے ''اسلام اور جدید معاشی نظریات'' کے نام سے کتاب لکھ کر تمام رائج نظریات کے کھوکھلے پن، تباہ کاریوں اور حماقتوں کو مبرہن کیا اور واقعات وحقائق کی بنیاد پر ان باطل نظریات کی قلعی کھول دی اور ان کی مضرتوں کی نشاندہی کی اور ثابت کیا کہ تہذیبی ارتقاء کے لیے اسلام کا معاشی نظریہ ہی کامیاب نظریہ ہے، باقی نظریات خود غرضی، ہوس اور نفع اندوزی پر مبنی ہیں۔ (ملاحظہ ہو مولانا کی کتاب ''اسلام اور جدید معاشی نظریات''۔

تہذیب کے باب میں مولانا مودودی کا صاف اور واضح موقف یہ ہے کہ ''دنیا کی کوئی تہذیب اس وقت تک غالب تہذیب کی حیثیت سے تسلیم نہیں کی جاسکتی جب تک کہ اس کے اندر مندرجہ ذیل تین شرطیں نہ پائی جائیں۔ یہ تین شرطیں گویا تہذیبی ارتقاء کی اصل اور اساس اور سرچشمہ کی حیثیت رکھتی ہیں:

۱۔ پہلی شرط یہ ہے کہ تہذیب اپنے کچھ اصول رکھتی ہو، اس کے اپنے امتیازات اور اپنی خصوصیات ہوں، وہ بے جڑ کے پودے کی مانند نہ ہو کہ ہوا کا ایک معمولی جھونکا بھی اسے اکھاڑ پھینکنے کے لیے کافی ہو۔

۲۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس کا افق وسیع ہو، اس کا انداز نظر جداگانہ ہو اور اس کے اندر دوسری تہذیبوں سے اخذ واستفادہ کی گنجائش وصلاحیت ہو۔

۳۔ تیسری اور سب سے اہم شرط یہ ہے کہ وہ آفاقی وعالمگیر ہو، اس کا پیغام عام ہو، وہ کسی محدود دائرہ میں محصور نہ ہو، اس کی جڑیں تاریخ میں پیوست ہوں اور وہ دنیا کی دوسری تہذیبوں کے ساتھ مفاہمت ومکالمہ کی اہلیت سے ہم کنار ہو۔

مولانا فرماتے ہیں: ''حکومت وفرمانروائی اور غلبہ واستیلا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ذہنی اور اخلاقی غلبہ، دوسرا سیاسی اور مادی غلبہ۔ ذہنی واخلاقی غلبہ یہ ہے کہ ایک قوم اپنی فطری قوتوں میں اتنی ترقی کر جائے کہ دوسری قومیں اس کے افکار پر ایمان لے آئیں، اسی کے تخیلات ومعتقدات، اسی کے نظریات دماغوں پر چھا جائیں۔ ذہنیں اسی کے سانچہ میں ڈھلیں، تہذیب اسی کی تہذیب ہو، علم اسی کا علم ہو، اسی کی تحقیق کو تحقیق سمجھا جائے اور ہر وہ چیز باطل قرار پائے جس کو وہ باطل ٹھہرائے۔'' گرچہ دونوں قسم کے غلبے لازم وملزوم نہیں ہیں لیکن فطرت کا قانون یہ ہے کہ جو قوم عقل وفکر سے کام لیتی ہے اور تحقیق وانکشاف کے میدان میں پیش قدمی کرتی ہے، اسے ذہنی ترقی کے ساتھ مادی وسیاسی ترقی بھی نصیب ہوتی۔ اس کے برعکس جو قومیں تفکر وتدبر کی راہ میں آگے بڑھنا چھوڑ دیتی ہیں وہ ذہنی انحطاط کے ساتھ مادی تنزلی میں بھی مبتلا ہو جاتی ہیں۔ (سید مودودی، نشان راہ، مکتبہ جماعت اسلامی ہند، ملیح آباد، لکھنو، ص: ۳)

مغربی تہذیب کے غلبہ پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں: ''مغرب کے غلبہ کا راز یہ ہے کہ انہوں نے غور وفکر کی قوتوں سے کام لیا، کائنات کے راز ٹٹولے اور فطرت کی چھپی ہوئی طاقتوں کے خزانے تلاش کیے نتیجۃً وہ دنیا کے امام وپیشوا بن گئے۔'' (سید مودودی، نشان راہ، مکتبہ جماعت اسلامی ہند، ملیح آباد، لکھنو، ص: ۷)

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اس وقت دنیا میں اسلامی تہذیب ہی وہ واحد تہذیب ہے جس سے اصلاً مغربی تہذیب کا ٹکراؤ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ایک مستقل دین اور مکمل تہذیب ہے، اس کا اپنا ایک ضابطہ ہے جو زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے اور مغربی تہذیب کے اصولوں سے بالکلیہ مختلف ہے۔

مغربی تہذیب جو اس وقت دنیا کی غالب تہذیب ہے، اس کے سلسلہ میں مولانا کا خیال ہے کہ اس کی اساس جس فکر وفلسفہ پر ہے وہ دہریت، الحاد، لامذہبی اور مادہ پرستی کی طرف جا رہے ہیں، اس کی پیدائش کے اول روز سے ہی مذہب کے ساتھ اس کی لڑائی ہے۔ اس میں نہ کسی علیم وقدیر خدا کے خوف کی گنجائش ہے، نہ وحی والہام کا کوئی وزن، نہ موت کے بعد کسی دوسری زندگی کا تصور ہے نہ حیات دنیا کے

حساب وکتاب کا کوئی کھٹکا، نہ ذاتی زندگی کی ذمہ داری کا کوئی سوال ہے نہ زندگی کے حیوانی مقاصد سے بالاتر کسی مقصد زندگی اور نصب العین کا امکان۔ یہ خالص مادی تہذیب ہے، اس کا پورا نظام خداترسی، راست روی، صداقت پسندی، حق گوئی، حسن اخلاق، امانت ودیانت، نیکی، حیا اور پاکیزگی کے ان تصورات سے خالی ہے جن پر اسلامی تہذیب کی بنیاد رکھی گئی ہے، اس کا نظریہ، اسلام کے نظریہ کی عین ضد ہے۔ اسلام جن چیزوں پر انسانی اخلاق اور تمدن کی بنا رکھتا ہے۔ ان کو یہ تہذیب بیخ وبن سے اکھاڑ دینا چاہتی ہے۔ گویا اسلام اور مغربی تہذیب دو ایسی کشتیاں ہیں جو بالکل مختلف سمتوں میں سفر کر رہی ہیں۔ جو شخص ان میں سے کسی ایک پر سوار ہوگا اسے لامحالہ دوسری کشتی کو چھوڑنا پڑے گا۔ اور جو بیک وقت دونوں پر سوار ہوگا اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔ (حوالہ سابق ص: ۱۷،۱۶)

دوسرے بہت سے مفکرین کی طرح مولانا کی نظر میں بھی تہذیب کی اصل مذہب ہے لیکن دنیا میں مذہب کا تصور بھی الگ الگ رہا ہے۔ مغربی تصور مذہب، اسلامی تصور سے یکسر مختلف ہے۔ اسلام میں مذہب کا تصور یہ ہے کہ وہ زندگی کا قانون ہے جبکہ اہل مغرب کے یہاں مذہب صرف شخصی اعتقاد کا نام ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام میں پہلی چیز ایمان باللہ ہے اور وہاں سرے سے اللہ کا وجود ہی مسلم نہیں ہے۔ اسلام کا پورا نظام تہذیب وحی ورسالت کے اعتقاد پر قائم ہے اور وہاں وحی کی حقیقت ہی مشکوک اور رسالت کے من جانب اللہ ہونے ہی میں شبہہ ہے، اسلام میں آخرت کا عقیدہ پورے نظام اخلاق کا سنگ بنیاد ہے اور وہاں یہ بنیاد خود بے بنیاد نظر آتی ہے۔ اس طرح اجتماعی مسائل میں بھی اسلام کا راستہ قریب قریب ہر معاملہ میں مغرب کے راستہ سے مختلف ہے۔ (ایضاً ص: ۳۰)

سید مودودیؒ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے عالم انسانیت کو تہذیب کے صحیح تصورات سے آشنا کیا۔ تہذیب جواب تک قوموں کے آداب وعلوم، اطوار معاشرت، انداز تمدن اور طرز سیاست وغیرہ سے عبارت تھی، مولانا نے بتایا کہ یہ چیزیں نفس تہذیب نہیں بلکہ تہذیب کے مظاہر یا شجر تہذیب کے برگ وبار ہیں۔

مولانا مودودیؒ کی نظر میں تہذیب جس چیز کا نام ہے اس کی ترکیب وتکوین درج ذیل پانچ عناصر سے ہوتی ہے:

۱۔ اس کا دنیوی زندگی کے سلسلہ میں تصور
۲۔ زندگی کا نصب العین
۳۔ عقائد وافکار

۴۔تربیت افراد

۵۔نظام اجتماعی

مولانا کے خیال میں دنیا کی ہر تہذیب انہی عناصر سے بنتی ہے اور تہذیب اسلامی کی تکوین بھی انہی سے ہوئی ہے۔مولانا نے اپنی کتاب''اسلامی تہذیب اوراس کے اصول ومبادی''میں ان عناصر کی وضاحت کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ مذکورہ بالا سوالوں کا جواب تلاش کیے بغیر روح تہذیب تک رسائی ممکن نہیں ہے۔(سید مودودی، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول مبادی،ص:۷-۱۳،مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز،نئی دہلی۔۲۰۰۶)

دنیوی زندگی کے تصور کے حوالہ سے وہ رقمطراز ہیں:''ابتداہی سے انسان کواپنے متعلق یہ غلط فہمی رہی ہے کہ کبھی تو وہ اپنے آپ کو دنیا کی سب سے بڑی ہستی سمجھ لیتا ہے اوراس کے نتیجہ جبر وقہر کا دیوتا اور شر وفساد کا مجموعہ بن جاتا ہے۔

کبھی اپنے آپ کو دنیا کی سب سے ذلیل وحقیر ہستی سمجھ لیتا ہے اور پھر درخت، پتھر، دریا، پہاڑ، جانور، آگ غرض ہر اس چیز کے آگے اپنی گردن جھکا دیتا ہے جس کے اندر کسی قسم کی طاقت یا مضرت ومنفعت نظر آتی ہے حتی کہ اپنے جیسے انسانوں میں بھی کوئی طاقت دیکھتا ہے تو انہیں بھی دیوتا مان لینے میں تأمل نہیں کرتا۔

مولانا نے افراط وتفریط پرمبنی ان دونوں تصورات زندگی کا جائزہ لے کر انہیں غلط اور جہالت قرار دیا ہے اور انسان کے سامنے اللہ کی کتاب کے حوالوں سے ایک معتدل شاہراہ زندگی کا تصور پیش کیا ہے۔(ایضاً،ص:۱۵)

قرآن مجید ان دونوں تصورات زندگی کی نفی کرتا ہے اور انسان کو اس کی اصل حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔ارشاد ہے:''فلینظر الانسان مما خلق ،خلق من ماء دافق ، یخرج من بین الصلب والترائب '' (الطارق:۷-۵)یعنی انسان غور کرے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے،ایک اچھلنے والے پانی کی بوند سے جو پیٹھ اور سینہ کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ایک جگہ فرمایا گیا:''وبدأ خلق الانسان من طین ، ثم جعل نسله من سللة من ماء مهین ، ثم سوّٰه و نفخ فیه من روحه وجعل لکم السّمع والابصاروالأفئدة قلیلا مّاتشکرون''(السجدۃ)

قرآن مجید اس طرح کی متعدد آیات کے ذریعہ انسان کے غرور وتکبر پر ضرب لگاتا ہے اور اسے اس کی اصل حیثیت یاد دلاتا ہے کہ وہ فرعونیت ونمرودیت اور جبر وقہر سے باز آئے اور خدا سے بغاوت

کر کے اس کی زمین میں شر وفساد کا باعث نہ بنے۔(ایضاً،ص:۱۶)

دوسری طرف قرآن پاک نوع بشر کو بتاتا ہے کہ وہ اتنی ذلیل مخلوق نہیں ہے جتنا اس نے اپنے آپ کو سمجھ لیا ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں اس کے لیے مسخر اور اس کی منفعت کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ انسان ان سب سے افضل ہے، وہ مخدوم ہے اس لیے مخدوم کا اپنے خدمت گاروں کے سامنے سر جھکانا، انہیں اپنا کارساز اور حاجت روا سمجھنا، ان سے التجائیں کرنا، ان سے ڈرنا اور خوف کھانا اور ان کی عظمت کے گیت گانا خود اپنے آپ کو ذلیل کرنا ہے اور ایسا کر کے وہ خود اپنا مرتبہ گراتا ہے۔ قرآن مجید نے انسان کی حیثیت متعین کی اور بہت وضاحت کے ساتھ بتایا کہ انسان اس دنیا میں اللہ کا خلیفہ اور اس کا نائب ہے۔ نائب کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے اصل کی اطاعت کرے، کسی بھی صورت اس سے بغاوت نہ کرے، اپنے آقا کی حاکمیت اور فرمانروائی کو تسلیم کرے۔ مولانا لکھتے ہیں: ''انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک حقیر مخلوق ہے۔ اسے جو عزت حاصل ہے وہ اس خلافت و نیابت الٰہی کی بنا پر ہے جو اسے زمین میں عطا کی گئی ہے۔ اب اس عزت کی حفاظت کا انحصار اس پر ہے کہ وہ شیطان کی پیروی کر کے اپنی روح کو گندا نہ کرے اور اپنے آپ کو نیابت کے درجہ سے گرا کر بغاوت کے مرتبہ میں نہ لے جائے کیونکہ اس صورت میں پھر وہ حقیر ہستی ہی رہ جائے گا۔'' (ایضاً،ص:۳۰)

خدا کا خلیفہ اور نائب ہونے کی حیثیت سے انسان کا اصل کمال یہ ہوگا کہ وہ اپنے آقا کی نیابت کا حق ادا کرے اور آقا کی املاک میں تصرف اسی شان سے کرے جس شان سے خود مالک حقیقی کرتا ہے۔ سید مودودی کے الفاظ میں: ''منصب نیابت کے استعمال کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ رعیت کی خبر گیری، ان کے ساتھ شفقت و مہربانی، حفاظت اور عدل کرنے میں وہی سیرت اختیار کرے جو خود بادشاہ حقیقی کی سیرت ہے اور بادشاہ کی املاک میں ویسی ہی حکمت، تدبر، دانائی اور احتیاط سے تصرف کرے جس سے خود بادشاہ تصرف کرتا ہے۔'' (ایضاً،ص:۳۳)

تصور زندگی کے حوالہ سے مولانا نے مختلف مذاہب کے نقطہائے نظر پیش کر کے زندگی کے فطری تصور پر روشنی ڈالی ہے۔ اور بتایا ہے کہ طبعی طور پر انسان کو جو قوتیں حاصل ہیں ان کا دائرہ محدود ہے اس لیے جب تک اس زندگی کے سلسلہ میں کوئی صحیح اور واضح تصور قائم نہ ہو، صحیح تہذیب وجود میں نہیں آسکتی۔

تصور حیات کے بعد دوسرا اہم مسئلہ نصب العین کا ہے۔ نصب العین تہذیبوں کے حسن و قبح کو جانچنے اور انسانوں کے ارادوں اور عملی کوششوں کا رخ طے کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ نصب

العین،ہی اصل میں وہ چیز ہے جس کی بنیاد پر راہِ عمل کا تعین ہوتا ہے اس لیے کسی تہذیب کے صحیح جائزہ کے لیے نصب العین کی جستجو ضروری ہے۔ یہ سچ ہے کہ دنیا کا ہر شخص فطری طور پر امن وسلامتی اور خوشی ومسرت کا طالب ہوتا ہے خواہ عملی اعتبار سے اس کا رویہ جو کچھ بھی ہو۔

دنیا کی مختلف تہذیبوں نے جو اجتماعی نصب العین پیش کیے ہیں سید مودودیؒ نے انہیں دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ اجتماعی تہذیبوں کی بنیاد کسی مذہبی وروحانی تخیل پر نہیں ہے، انہوں نے اپنے متبعین کے سامنے تفوق اور برتری کا نصب العین پیش کیا۔ مولانا کے خیال میں اس نصب العین کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں:

الف: سیاسی غلبہ

ب: دولت وثروت میں سب سے آگے بڑھ جانے کی کوشش

ج: عمرانی ترقی میں سب پر سبقت لے جانے کی خواہش۔ خواہ وہ علوم وفنون کے اعتبار سے ہو یا آثارِ مدنیت وتہذیب میں شان وشکوہ کے اعتبار سے۔

اس کے بعد اس نصب العین پر تنقیدی نگاہ ڈال کر بتایا ہے کہ: اس نصب العین کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تہذیبوں کے درمیان شدید سیاسی، معاشی اور تہذیبی کشمکش برپا ہو جاتی ہے۔'' (ایضاً، ص: ۷۱)

۲۔ جن تہذیبوں کی بنیاد کسی روحانی تخیل پر رکھی گئی ہے، انہوں نے عموماً ''نجات'' کو اپنا نصب العین قرار دیا ہوا ہے۔

مولانا کی نظر میں یہ نصب العین بھی درست اور صحیح نہیں ہے کیونکہ: اوّلاً: اس نصب العین میں خود غرضی چھپی ہوئی ہے۔ ثانیاً: اس وجہ سے کہ نجات کا تعلق اصلاً طریقہ نجات سے ہے اور طریقہ نجات کے سلسلہ میں مختلف مذاہب کے تصورات جداگانہ ہیں۔ کسی کے یہاں ترکِ دنیا اور رہبانیت ذریعہ نجات ہے تو کسی کے یہاں مختلف دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی طریقۂ نجات ہے۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ نجات کا تصور روحانی اعتبار سے خواہ کتنا ہی پاکیزہ کیوں نہ ہو لیکن دنیوی نقطہ نظر سے اپنے اندر کوئی ایسی چیز نہیں رکھتا جو ایک قوم کو بحیثیت قوم ابھارنے والی اور حرکت وعمل پر آمادہ کرنے والی ہو۔ مذکورہ وجوہ سے یہ دونوں نصب العین صحیح نہیں۔

اس ضمن میں تیسرا عنصر یہ ہے کہ انسانی سیرت کی تعمیر کن افکار وعقائد پر ہوئی ہے۔ ذہن کو وہ کس سانچہ میں ڈھالتی ہے اور وہ کون سے محرکاتِ عمل ہیں جو انسان کو ایک خاص طرزِ عمل کے لیے تیار کرتے ہیں۔ کیونکہ عمل، فکر کا تابع ہوتا ہے لہٰذا جیسے افکار وعقائد ہوں گے، عمل بھی اس کے مطابق ہوگا۔ (ایضاً،

ص:۷۳-۷۵)

اس لحاظ سے انسان کی عملی زندگی کا انحصار اس بات پر ہے کہ چند مخصوص خیالات اس کے اندر اتنا رسوخ پا جائیں کہ پراگندہ خیالی کا امکان باقی نہ رہے۔ مولانا کے خیال میں اسی مخصوص ذہنی ساخت کا قرآنی نام ایمان ہے، جو کسی تہذیب کے حسن وقبح کو پرکھنے کا اہم ترین ذریعہ اور اس کا اساسی عنصر ہے۔ (ایضاً ص:۱۱۳)

مولانا لکھتے ہیں: ''اگر مختلف افراد مختلف قسم کے عقائد وافکار پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کی سیرتیں مختلف ومتضاد بنیاد پر قائم ہیں تو اجتماعی ہیئت نہیں بن سکتی۔ ان کی مثال ایسی ہوگی جیسے ایک میدان میں بہت سے پتھر بکھرے پڑے ہوں، ہر پتھر اپنی جگہ یقیناً مضبوط ہے مگر ان کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے۔ برخلاف اس کے کہ اگر ایک مشترک تخیل بہت سے افراد کے دلوں میں ایمان بن کر جم جائے تو اشتراک ایمانی کا رابطہ انہیں ایک قوم بنادے گا۔ گویا وہی پتھر جو بکھرے پڑے تھے چونے سے جوڑ دئے گئے اور ایک مضبوط دیوار قائم ہوگئی۔ اب ان کے درمیان تعامل وتعاون شروع ہوجائے گا جس سے ترقی کی رفتار تیز ہوگی۔ ایک قسم کا ایمان ان کی سیرتوں میں ہم آہنگی اور اعمال میں یک رنگی پیدا کردے گا۔ اس سے ایک خاص قسم کا تمدن اور ایک خاص شان کی تہذیب ظاہر ہوگی، ایک نئی قوم، نئی سیرت، نئی ذہنیت، نئے خیالات، نئے طریقِ عمل کے ساتھ اٹھے گی اور اپنی تہذیب کا قصر تعمیر کرے گی۔'' (ایضاً ص:۱۱۴)

یوں تو دنیا کی ہر تہذیب کی تشکیل وتعمیر میں ان ایمانیات کا بڑا کردار ہے جو قوموں کی سیرت کو بناتے اور پختہ کرتے ہیں۔ گویا انسانی عمل کا صحیح وغلط، اچھا اور برا ہونا انہی ایمانیات کی صحت پر موقوف ہے۔ ایمانیات کی درستگی سیرت کی درستگی کا باعث ہوگی، اور ایمان کی پختگی عمل کی پختگی کا موجب بنے گی۔ سید مودودیؒ نے اسلام کی ایمانیات پر تفصیل سے بحث کی ہے اور ہر عقیدہ کا عقلی مرتبہ، انسانی سیرت پر اس کے اثرات اور تہذیب کی تاسیس میں اس کے کردار کی وضاحت کی ہے۔ مولانا نے ثابت کیا ہے کہ کسی بھی تہذیب کا سنگِ بنیاد، دنیوی زندگی کے سلسلہ میں اس کا یہ تصور ہونا چاہیے کہ انسان اس زمین پر اس کے خالق ومالک کا نائب ہے۔ اس تصور کے نتیجہ میں اس کی زندگی کا نصب العین اپنے آقا کی خوشنودی کا حصول قرار پائے گا اور اس نصب العین کے حصول کے لیے ضروری ہوگا کہ:

۱۔ اسے خدا کی صحیح معرفت حاصل ہو۔

۲۔ وہ صرف خدا کو اپنا حاکم ومطاع سمجھے اور اپنے اختیارات کو اس کے حکم کے تابع کردے۔

۳۔ وہ ان طریقوں کو تلاش ومعلوم کرے جن سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔

۴۔ پھر اسے یہ بھی معلوم ہو کہ خدا کی خوشنودی کے ثمرات اور اس کی ناخوشی کے نتائج کیا ہوں گے تا کہ وہ حیات دنیوی سے دھوکہ نہ کھائے۔(ایضاً،ص:۳۲۴)

اسلام کے پانچوں عقائد (ایمان باللہ، ایمان بالرسل، ایمان بالکتب، ایمان بالملائکہ اور ایمان بالآخرت) دراصل اسی ضرورت کی تکمیل ہیں۔ انہی کے اندر وہ صلاحیت ہے جس سے ایک ایسی تہذیب وجود میں آئے گی جو انسان کی امن وسکون، خوشحالی واطمینان قلب کی فطری خواہش اور ضرورت کو پورا کر سکے، انہی عقائد وایمانیات کی بدولت کوئی تہذیب دین ودنیا کی جامع اور ایک آفاقی تہذیب تشکیل پاسکتی ہے۔

اس معنی میں صرف اسلامی تہذیب ہے جو انسانی اخلاق، معاشرت اور تمدن کو سنوار سکتی ہے۔ انسان کو دونوں جہان کی کامیابی سے ہمکنار کر سکتی ہے اور اسے صحیح معنوں میں حقیقی امن وسکون سے بہرہ مند کر سکتی ہے نیز اپنے عقائد وافکار کے اعتبار سے دنیا کی ہمہ گیر اور آفاقی تہذیب بن سکتی ہے۔ الغرض مولانا کے پیش کردہ تہذیبی عناصر سے جو تہذیب تشکیل پاتی ہے، اس کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

۱۔ اس تہذیب میں حاکم مطلق صرف خدا ہے، رسول اس کا نمائندہ اور قرآن اس کا آئین ہو۔

۲۔ اس کا مقصد وحید آخرت کی کامیابی کے لیے انسان کو تیار کرنا ہو۔

۳۔ وہ ملکی، قومی یا نسلی بنیادوں پر قائم نہ ہو۔

۴۔ اس کے اندر زبردست ڈسپلن اور مضبوط گرفت ہو۔

۵۔ اس کا مقصود اصلی معاشرہ کی اصلاح اور نفوس کا تزکیہ ہو۔(اقبال اور مودودی، حوالہ سابق، ص:۸۲)

۶۔ اس کے اندر وہ قوت ہو جو انسان کے اندر اعلیٰ خصائص کو فروغ دے سکے تا کہ وہ اس زندگی میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔

یہ وہ خصوصیات ہیں جن سے صرف اسلامی تہذیب ہی بہرہ ور ہے، دنیا کی کسی تہذیب کے پاس وہ ایمانی قوت سرے سے ہے ہی نہیں جس سے اس کے اندر یہ خصائص پیدا ہوسکیں۔

مسئلہ فلسطین: منظر اور پس منظر

ابوالاعلی سید سبحانی

فلسطین کی سیاسی اور مذہبی تاریخ کیا رہی ہے، نیز مسئلہ فلسطین کی شرعی اور دینی حیثیت کیا ہے، ان امور پر گفتگو کے بجائے اس تحریر میں محض 'مسئلہ فلسطین اور اسرائیلی جارحیت' کے تناظر میں مختصراً کچھ تاریخی حقائق بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس مضمون میں بیشتر اعداد وشمار اور تاریخی حوالہ جات کے سلسلے میں فلسطینی امور کے ماہر ڈاکٹر محسن صالح کی تصنیف 'حقائق وثوابت فی القضیۃ الفلسطینیۃ' سے خصوصی استفادہ کیا گیا ہے۔

یہودی ریاست کے قیام کا پس منظر

گزشتہ صدیوں میں یہودیوں کے درمیان یہودی ریاست کے قیام کا خیال مضبوط ہوتا چلا گیا، اس خیال کو چار عناصر نے خاص طور سے تقویت پہنچائی:

(۱) یہودیوں کا مخصوص سازشی مزاج: یہودیوں کا مخصوص سازشی مزاج معروف ہے، وہ کسی بھی سماج میں گھل مل کر نہیں رہ سکتے، ان کے درمیان معروف روشن خیال تحریک 'ہسکلا' کے قیام کا ایک بنیادی ہدف یہ بھی تھا کہ وہ اس مزاج کے برخلاف سماج میں مل جل کر رہنے کا مزاج پیدا کریں، تاہم یہ تحریک مکمل طور سے ناکام رہی، اس تحریک کی ناکامی کے بعد سے ہی ان کے درمیان اس قسم کے خیالات تیزی کے ساتھ ابھر کر سامنے آنے لگے تھے کہ انہیں اپنی ایک الگ ریاست تشکیل دینی ہوگی، جہاں وہ سکون اور اطمینان کے ساتھ رہ سکیں۔

(۲) جدید قومی نظریات: یورپ میں گزشتہ صدیوں بالخصوص انیسویں صدی میں جب قومی نظریات پر مبنی حکومتوں کا قیام عمل میں آنا شروع ہوگیا، اور عیسائی ریاستیں مضبوط ہونے لگیں، اس وقت یہودیوں کے درمیان بھی قومی نظریات انگڑائی لینے لگے تھے، پروٹسٹنٹ چونکہ سولہویں صدی سے اس کا نعرہ لگا رہے تھے، چنانچہ انہوں نے بھی اس موقع کو غنیمت سمجھا اور بہت ہی منصوبہ بندی کے ساتھ اس

خیال کو حقیقت کا جامہ پہنانے کی کوششیں شروع کردیں۔ بعد میں اس کے لیے ۱۸۹۷ء میں صہیونی تحریک کا قیام عمل میں لایا گیا، اس تحریک نے فلسطین میں اسرائیلی ریاست کے قیام کی عالمی پیمانے پر بہت ہی پرزور اور بہت ہی منصوبہ بند تحریک چلائی۔

(۳) مغربی دنیا کی خطرناک چال: ایک اہم چیز مغربی دنیا کی سازش بھی تھی، مغربی دنیا یہودیوں کے سازشی مزاج اور حکومتوں کے خلاف ان کی ریشہ دوانیوں سے اچھی طرح واقف تھی، چنانچہ اس نے یہودیوں کی الگ ریاست کی تشکیل کے لیے نہ صرف راہ ہموار کی، بلکہ اس ریاست کی سرپرستی بھی کھل کر قبول کی۔ مغرب کا خیال تھا کہ اس طرح جہاں ایک طرف اسے اُن کی حرکتوں سے نجات مل جائے گی، وہیں اُن کو مسلم دنیا سے ٹکرا کر عیسائی دنیا سے ان کی قدیم دشمنی کا باب بھی بند کیا جا سکے گا۔

(۴) یہودی قوم کی مظلومیت کا سہارا: یہودیوں کے اپنے مزاج اور حرکتوں کے سبب کسی بھی حکومت کے لیے ان کو زیادہ دیر برداشت کرنا ممکن نہ تھا، ان کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ اپنے اس مزاج کے سبب کہیں بھی سکون کے ساتھ زیادہ دن تک نہیں رہ سکے، بعد کے زمانے میں روس اور دیگر ممالک نے ان کے اوپر کافی مظالم ڈھائے، اور پھر ہولوکاسٹ کے ڈرامہ کے ذریعہ نہ صرف ان کی مظلومیت کا خوب خوب چرچا کیا گیا، بلکہ عالمی سطح پر علیحدہ یہودی ریاست کے قیام کے لیے راہ بھی ہموار کی گئی۔

فلسطین ہی کا انتخاب کیوں؟

یہودیوں کے پاس اسرائیلی ریاست کے قیام کے لیے ایک سے زائد آپشن موجود تھے، تاہم انہوں نے فلسطین کو اس کے لیے منتخب کیا، اور برطانیہ نے بھی اس کی بھرپور تائید اور ہر ممکن مدد کی۔ اس کی جہاں ایک مذہبی بنیاد ہے، یعنی مذہبی تعلیمات کے مطابق ہیکل سلیمانی کی تعمیر ہے، وہیں اس کے پیچھے مغربی دنیا کی کچھ خطرناک قسم کی سیاسی سازشیں بھی رہی ہیں۔ مغرب کو معلوم ہے کہ اگر اپنے عزائم کے مطابق یہودی عظیم اسرائیل کا خواب پورا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، تو وہ مسلم دنیا کی سیاست میں ایک خطرناک رول ادا کر سکتے ہیں، وہ جہاں افریقی اور ایشیائی مسلم ممالک کے درمیان ایک حد فاصل ہوں گے، وہیں اس پورے خطے کو اپنی سازشوں کا شکار بھی بنائے رہیں گے۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ اسرائیلی ریاست کے قیام کے بعد سے پوری مسلم دنیا عجیب وغریب قسم کے خلفشار اور مصیبتوں سے دوچار ہے۔ یہ ایک تفصیلی موضوع ہے کہ یہودی ریاست کے قیام کے مشرق وسطی یا مسلم دنیا کے ممالک کی سیاست پر کیا خطرناک اثرات رونما ہوئے، تاہم یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ اسرائیلی ریاست اس وقت مسلم دنیا کی سیاست میں ایک خطرناک اور مؤثر کردار ادا کر رہی ہے۔ خواہ وہ مصر کی منتخب جمہوریت کا تختہ پلٹنے کا مسئلہ ہو، عالم اسلام کی عظیم اسلامی تحریکات پر دہشت گردی

کے الزام اوران کے کارکنوں کی بڑے پیمانے پر گرفتاری کا مسئلہ ہو، عالم اسلام میں جمہوری اور خود مختار حکومتوں کے قیام میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کا مسئلہ ہو، یا عالم اسلام کی حکومتوں کو معاشی طور پر دوسروں پر منحصر بنائے رکھنا کا مسئلہ ہو، ان تمام ہی امور میں اسرائیل ایک نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔ ڈاکٹر محسن صالح کے بقول:

''صورتحال اب یہ ہوگئی ہے کہ اسرائیل کی مضبوطی کے لیے ضروری ہے کہ اطراف کے مسلم ممالک کو کمزور سے کمزور کر دیا جائے، اور عالم اسلام کی مضبوطی، بیداری اور اتحاد کے لیے شرط ہے کہ اسرائیل کے ذریعہ عالم اسلام پر مسلط کردہ صہیونی منصوبے کو کمزور سے کمزور تر کر دیا جائے''۔ (ثوابت وحقائق فی القضیۃ الفلسطینیۃ)

مسئلہ فلسطین کو بعض لوگ یہودیوں کا مذہبی مسئلہ قرار دیتے ہیں، یقیناً اس میں مذہبی رنگ بھی موجود ہے، تاہم گزشتہ ایک صدی سے اس مسئلہ میں جو مدو جزر سامنے آئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک مذہبی مسئلے سے زیادہ سیاسی مسئلہ ہے، اور اس کی بنیاد اسلام دشمن سیاسی ایجنڈا ہے، جس میں مغربی دنیا یہودیوں کو محض ایک کارڈ کے طور پر استعمال کر رہی ہے۔

صہیونی تحریک کاآغاز اور مغرب کا کردار

۱۸۸۰ء سے اسرائیل کے قیام کے لیے راہیں ہموار کرنے کا کام شروع کر دیا گیا تھا، اس کے لیے عالمی سطح پر تحریک چلائی گئی کہ یہودی دنیا کے مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے فلسطین جائیں اور وہاں آباد ہونا شروع کریں، اور فلسطین میں برطانوی استعمار کے ذریعے بڑے پیمانے پر زمینوں کی خریداری کا کام بھی شروع کر دیا گیا۔ اس کے بعد ۱۸۹۷ء میں مشہور یہودی لیڈر تھیوڈو ہرزل نے صہیونی تحریک کا باقاعدہ آغاز کیا، تاکہ عظیم اسرائیل کا قیام عمل میں لایا جا سکے، اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کا کام بھی سرانجام دیا جائے۔ تاہم پہلی جنگ عظیم تک صہیونی تحریک اپنے مقاصد میں کوئی نمایاں کامیابی نہیں حاصل کر سکی۔ ۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگ عظیم ہوئی تو اس موقع پر ڈاکٹر وائزمین جو اس وقت یہودیوں کے قومی وطن کی تحریک کا علمبردار تھا، اس نے عالمی طاقتوں سے رابطہ کرنا شروع کر دیا، ابتدا میں جرمنی سے ساز باز ہوئی لیکن اس میں کوئی خاص کامیابی ملتی نظر نہ آئی، چنانچہ صہیونی تحریک کی جانب سے برطانیہ کے ساتھ معاہدہ کیا گیا کہ پوری دنیا کے یہودی اس جنگ میں ہر طرح سے برطانیہ کا تعاون کریں گے، اس شرط پر کہ وہ فتحیاب ہونے کے بعد فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی ضمانت دے دے۔

دوسری طرف برطانیہ اور یہودیوں کی خفیہ ایجنسیوں کو معلوم تھا کہ ترکی حکومت کے برقرار رہتے ہوئے اسرائیلی حکومت کا قیام آسان نہیں ہوگا۔ جنگ عظیم اول کے زمانے میں ترکی حکومت اپنے رہے

سے حالات میں بھی کافی مضبوط تھی، اور مسلم دنیا کی قوت اور شکوہ کی ایک علامت سمجھی جاتی تھی۔ اس رکاوٹ سے نبٹنے کے لیے ترک اور عرب قومیت کا فتنہ کھڑا کیا گیا، اس سے اول تو دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل لے آیا گیا، دوسرے برطانیہ کے ذریعہ شریف مکہ کو اس بات کا تحریری وعدہ دیا گیا کہ ترکی حکومت سے الگ ہونے پر اُن کی ایک خودمختار عرب ریاست بنائی جائے گی، چنانچہ عربوں نے ترکوں سے بغاوت کر کے فلسطین، عراق اور شام پر برطانیہ کا قبضہ کرا دیا۔

جنگ عظیم اول کے بعد برطانیہ نے یہودیوں سے کیے گئے معاہدے کے مطابق اپنا وعدہ پورا کر دیا، اور ۲ر نومبر ۱۹۱۷ء کو وہ خطرناک اعلان کیا گیا جو 'اعلان بالفور' کے نام سے مشہور ہے، جو فی الواقع اسرائیلی ریاست کی پہلی اینٹ تھی۔ اس طرح ایک سال سے بھی کم مدت میں یعنی ستمبر ۱۹۱۸ء تک برطانیہ نے خفیہ طور پر خاموشی کے ساتھ فلسطین پر یہودیوں کا قبضہ کرا دیا۔ دوسری جانب شریف مکہ سے کیے گئے وعدے کے برخلاف مئی ۱۹۱۶ء کے سائیکس پیکو معاہدے کی رو سے شام اور عراق کو برطانیہ اور فرانس کے درمیان تقسیم کر دیا گیا، جبکہ فلسطین کو عالمی علاقہ قرار دے دیا گیا، اور پھر اپریل ۱۹۲۰ء کے 'سان ریمو' معاہدے کے مطابق برطانیہ نے فلسطین کو بظاہر اپنے قبضے میں لے لیا۔ ۱۹۲۲ء میں مجلس اقوام (لیگ آف نیشن) نے مخصوص شرائط کے ساتھ فلسطین کا اقتدار برطانیہ کے سپرد کر دیا، چنانچہ اب مجلس اقوام کی جانب سے باقاعدہ برطانیہ کو مکمل طور سے اسرائیلی ریاست کے قیام کے لیے راہیں ہموار کرنے کا موقع فراہم کر دیا گیا۔ مولانا مودودی علیہ الرحمہ مجلس اقوام کے اس فیصلے پر لکھتے ہیں کہ

''مجلس اقوام نے برطانیہ کو انتداب کا پروانہ دیتے ہوئے پوری بے شرمی کے ساتھ یہ ہدایت کی کہ اس کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کے لیے ہر طرح کی آسانیاں فراہم کرے۔ صہیونی تنظیم کو سرکاری طور سے باقاعدہ تسلیم کر کے اسے نظم و نسق میں شریک کرے اور اس کے مشورے اور تعاون سے یہودی قومی وطن کی تجویز کو عملی جامہ پہنائے۔ اس کے ساتھ وہاں کے قدیم اور اصل باشندوں کے لیے صرف اتنی ہدایت پر اکتفاء کیا گیا کہ ان کے مذہبی اور مدنی (سول) حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ سیاسی حقوق کا اس میں سرے سے کوئی ذکر نہ تھا۔ یہ تھا مجلس اقوام کا انصاف جسے دنیا میں امن قائم کرنے کا نام لے کر وجود میں لایا گیا تھا۔ اس نے یہودیوں کو باہر سے لا کر بسانے والوں کو تو سیاسی اقتدار میں شریک کر دیا اور ملک کے اصل باشندوں کو اس کا مستحق بھی نہ سمجھا کہ ان کے سیاسی حقوق کا برائے نام بھی تذکرہ کر دیا جاتا''۔ (یہودیوں کا منصوبہ)

۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۸ء کے درمیان برطانیہ نے یہودیوں کو فلسطین میں آبادکاری کا پورا موقع فراہم کیا، ۱۹۱۸ء میں یہاں یہودیوں کی آبادی ۵۵ر ہزار تھی، اور ۱۹۴۸ء میں یہ بڑھ کر ۶۴۶ر ہزار تک یعنی

۸رفیصد سے بڑھ کر تقریباً ۲۳رفیصد تک پہنچ گئی۔اسی طرح بڑے پیمانے پر فلسطینی اراضی پر بھی یہودیوں کو قبضہ دلایا گیا۔یہ ۳۰رسال فلسطین کی مسلم آبادی کے لیے کسی بھی طور سے ایک سخت ترین آزمائش سے کم نہ تھے،اس دوران ان کو ہر طرح سے دبا کر رکھنے اور کمزور کرنے کی کوشش کی گئی۔اس کے برعکس یہودیوں کو معاشی،سیاسی،عسکری،تعلیمی اور سماجی ہر پہلو سے مضبوط کیا گیا۔اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۴۸ء میں جب عالمی طاقتوں کی نگرانی اور سرپرستی میں پوری تیاری کے ساتھ یہودیوں نے اسرائیلی ریاست کے قیام کا اعلان کیا،اس وقت ان کے پاس اپنی ستر ہزار سے زائد تربیت یافتہ افواج موجود تھیں۔

فلسطینی مزاحمت کی ابتداء

اس خطرناک اور گہری سازش کے باوجود،جبکہ طاقت اور قوت کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے فلسطین پر قبضہ کیا گیا،اور عالمی طاقتوں کی جانب سے اس کی کھل کر تائید کی گئی،فلسطین کے خوددار عوام نے نہ تو کبھی برطانوی استعمار کو قبول کیا،اور نہ ہی صہیونی منصوبوں کے سامنے گھٹنے ٹیکے،فلسطین کے خوددار عوام نے ہمیشہ ہی آزادی کا علم بلند کیے رکھا۔۱۹۲۰ء کے بعد ہی سے فلسطینی عوام نے موسیٰ کاظم،امین الحسینی اور ان کے ساتھیوں کی قیادت میں آزادی کے لیے جدوجہد کا آغاز کردیا تھا،چنانچہ ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۱ء،۱۹۲۹ء،۱۹۳۳ء میں زبردست تحریکیں چلائی گئیں،۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۹ء میں اس تحریک آزادی کی قیادت عزالدین القسام اور عبدالقادر الحسینی نے کی،اور اس قدر عوامی دباؤ بنایا کہ مئی ۱۹۳۹ء میں برطانیہ کو دس سال کے اندر فلسطینی حکومت کے قیام کے سلسلے میں معاہدہ کرنا پڑ گیا،اس معاہدے میں یہ بات بھی شامل تھی کہ برطانوی حکومت مخصوص علاقوں کو چھوڑ کر فلسطین کی اراضی یہودیوں کے ہاتھ فروخت نہیں کرسکتی،اور پانچ سال کے اندر اندر یہودیوں کے فلسطین آنے پر مکمل پابندی لگائی جائے گی۔تاہم نومبر ۱۹۴۵ء میں برطانیہ نے معاہدہ شکنی کرتے ہوئے اس مسئلے سے علیحدگی اختیار کرلی،اور امریکہ نے اسرائیل کی سرپرستی کا ذمہ لے لیا۔

اقوام متحدہ کا خطرناک موقف

برطانیہ کی اس معاہدہ شکنی سے خطرناک واقعہ نومبر ۱۹۴۷ء میں پیش آیا،جبکہ اقوام متحدہ کی جنرل کونسل نے اپنے ۱۸۱رنمبر کے فیصلے کے تحت فلسطین کو عرب اور یہودی دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ اس قدر کھلی دھاندلی کی گئی کہ ملک کا ۵۴رفیصد علاقہ یہودی مملکت کے لیے متعین کیا گیا،اور محض ۴۵رفیصد علاقہ عرب مملکت کے لیے،جبکہ قدس والے ایک فیصد علاقے کو انٹرنیشنل ایریا شمار کیا گیا۔ڈاکٹر محسن صالح کے مطابق ''خود اقوام متحدہ کے اصولوں کے مطابق یہ لازمی فیصلہ نہیں تھا،اور دوسری بات یہ کہ

اقوام متحدہ کی بنیاد سے یہ فیصلہ ٹکرا رہا تھا، اقوام متحدہ کی بنیاد ہی یہی ہے کہ آزادی ہر ملک اور ہر قوم کا بنیادی حق ہے، اور اس آزادی کا فیصلہ ملک اور اس کی عوام خود کریں گے۔ اس کے علاوہ ایک بڑی غلطی اس میں یہ ہوئی کہ اس فیصلے سے پہلے فلسطینی عوام جو اس مسئلے کا کلیدی حصہ تھے، ان سے نہ تو مشورہ لیا گیا، اور نہ ملک میں کوئی عوامی ریفرنڈم کرایا گیا۔ اس طرح یہودی صہیونی اقلیت جو بعد میں یہاں آ کر آباد ہوئی ان کو زمین کا اہم اور بڑا حصہ دے کر اقوام متحدہ کی جانب سے ظلم اور چیرہ دستی کا بدترین مظاہرہ کیا گیا''۔

ناجائز اسرائیلی ریاست کا قیام اور عرب ممالک کا رول

آخر کار ۱۴/مئی ۱۹۴۸ء کو وہ دردناک واقعہ پیش آ ہی گیا، جس کے لیے ایک عرصے سے مختلف عالمی طاقتوں کے تعاون سے سازشیں رچی جا رہی تھیں، تاہم اس وقت عرب حکومتوں کی جانب سے جو کردار سامنے آیا، وہ یک گونہ تشویشناک تھا۔ ۱۴/مئی ۱۹۴۸ء کو عرب افواج کو یہودی افواج کے سامنے اپنی ناتجربہ کاری، قلت معلومات اور منظّم نہ ہونے کے سبب خطرناک شکست کا سامنا کرنا پڑا، اور یہودی افواج نے اسرائیل کے قیام کا باقاعدہ اعلان کرتے ہوئے ۷۷/فیصد فلسطینی اراضی پر قبضہ کر لیا، اور آٹھ لاکھ فلسطینیوں کو بے گھر ہونے پر مجبور کر دیا، جبکہ اس وقت فلسطین کی مکمل آبادی تقریباً ۱۴/لاکھ تھی۔ اسی طرح ۵۸۵/فلسطینی آبادیوں میں سے ۴۷۸/آبادیوں کو مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ اس موقع پر ۳۴/بڑے قتل عام بھی کیے گئے۔ اس موقع پر فلسطین کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے باقی ماندہ فلسطین کے مغربی حصے کو اردن کے زیرِ انتظام دے دیا گیا، اور غزہ پٹی کے علاقے کو مصر کے زیرِ انتظام، اور جفا پر جفا یہ ہوئی کہ ۱۹۴۹ء ہی میں اسرائیل کو اقوام متحدہ کی ممبر شپ دے دی گئی۔

اسرائیلی استعمار کے قابض ہو جانے کے بعد ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۷ء تک لاچار اور مظلوم فلسطینی عوام کی جانب سے مستقل آزادی اور انصاف کے لیے جدوجہد جاری رہی، اس دوران جمال عبدالناصر نے عرب ممالک کی رسمی طور پر نمائندگی کی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عرب ملکوں کی جانب سے اس سلسلے میں بہت ہی غیر ذمہ دارانہ اور غیر سنجیدگی کا رویہ اختیار کیا گیا۔ فلسطینی عوام کا مسلسل جذباتی استحصال کیا جاتا رہا، اور آئندہ معرکہ کے لیے کوئی بھی منصوبہ بندی یا تیاری نہیں کی گئی، جبکہ اس دوران اسرائیل زبردست تیاریوں میں لگا رہا۔

۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۴ء کے نازک حالات کے پیش نظر فلسطین میں باقاعدہ کوئی علانیہ تحریک آزادی شروع نہیں کی جا سکی، اس دوران اخوان المسلمون کی کوششوں سے بعض خفیہ و نیم خفیہ تحریکیں آزادی وانصاف کے لیے عوامی بیداری کا کام کرتی رہیں، اسی سلسلے کی ایک کڑی ۱۹۵۷ء میں 'الفتح' کا قیام ہے،

جواس وقت مسلح جدوجہد پر یقین رکھتی تھی، اور ۱۹۴۸ء کے علاقوں تک واپسی اس کے پروگرام کا بنیادی حصہ تھا۔ ان تمام تبدیلیوں کو دیکھتے ہوئے جمال عبدالناصر نے ۱۹۶۴ء میں احمد قشیری کی قیادت میں منظمۃ التحریر الفلسطینیہ کے قیام کے لیے پیش رفت کی۔ عام فلسطینیوں کی جانب سے اس پیش رفت کو بہت ہی سراہا گیا، اور چند سال کے اندر یعنی ۱۹۶۸ء تک فلسطین کے مختلف گروپس اس سے وابستہ ہو گئے، الفتح نے بھی اس میں شمولیت اختیار کر لی، اور فروری ۱۹۶۹ء میں 'یاسر عرفات' اس کے صدر منتخب ہوئے۔ یہ فلسطینیوں کی متحدہ آواز بن کر سامنے آئی، اور ۱۹۷۴ء میں عرب ممالک نے اس کو فلسطین کی واحد قیادت کے طور پر قبول کر لیا، چنانچہ اسی سال اس کو اقوام متحدہ میں آبزرور ممبر کے طور پر شریک ہونے کا موقع بھی مل گیا۔

اسی دوران ۱۹۶۷ء کی بھیانک جنگ کا سامنا ہوا، عرب ممالک کی جانب سے عدم سنجیدگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند دنوں کے اندر اسرائیل نے عرب افواج کو بری طرح شکست سے دوچار کر دیا، اور پورے فلسطین پر قابض ہو گیا، مغربی کنارے اور غزہ پٹی کے علاقے پر بھی اس نے اسرائیلی پرچم لہرا دیا، اسی طرح گولان کی پہاڑیاں (سیریا) اور مصر کا سینائی علاقہ بھی اس نے اپنے تسلط میں لے لیا۔

اسرائیل کی بڑھتی جارحیت

۱۹۴۸ء سے اب تک اسرائیل فلسطین کو یہودی رنگ میں رنگنے کے لیے مسلسل کوشش کر رہا ہے، ایک طرف فلسطینی آثار کو مٹانے، نئی آبادیاں بسانے، نئی تعمیرات کرانے، اور دنیا بھر سے یہودیوں کو یہاں لا کر بسانے کا عمل جاری ہے، دوسری طرف اہل فلسطین پر عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا ہے، مغربی کنارے کے عوام کو مجبور محض بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے، جبکہ غزہ پٹی کے علاقے کو ایک بڑی جیل میں تبدیل کر دیا گیا ہے، جہاں بنیادی انسانی ضروریات کی حصولیابی تک بہت مشکل ہے۔ اسرائیل کی اس دوران ایک اور خطرناک حرکت قدس کے علاقے میں یہ سامنے آئی کہ اس نے قدس کے ۸۶/فیصد علاقے پر یہودی بستیاں تعمیر کر لیں، مسجد اقصی پر مکمل طور سے قبضہ کر لیا، ۱۹۶۹ء میں مسجد اقصی میں آگ لگانے کا پہلا واقعہ پیش آیا، اس کے بعد سے مسلم جذبات کو بھڑکانے کے لیے مستقل کچھ نہ کچھ واقعات پیش آ رہے ہیں۔ اسی طرح قدس کو اسرائیل کا مستقل دارالسلطنت قرار دینے کی بات بھی کہی جا رہی ہے۔

پناہ گزینوں کا مسئلہ اور اقوام متحدہ کی قراردادیں

اس وقت ایک بہت بڑا مسئلہ فلسطینی پناہ گزینوں کا ہے، ۲۰۱۲ء تک کے اعداد و شمار کے مطابق اس وقت ۵۸/لاکھ فلسطینی دیگر ممالک میں پناہ گزیں ہیں، جبکہ ۱۹/لاکھ بیس ہزار غزہ اور مغربی علاقے میں پناہ گزیں ہیں۔ اسی طرح ڈیڑھ لاکھ فلسطینی ۱۹۴۸ء سے در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہیں، اور ان کو

اب تک کوئی ٹھکانہ نہیں مل سکا ہے۔ جس طرح فلسطین کا مسئلہ انسانی دنیا کا سب سے قدیم اور خطرناک سانحہ ہے، اسی طرح یہ تعداد دنیا بھر میں پناہ گزینوں کی سب سے بڑی تعداد ہے۔ ان کی واپسی کے سلسلے میں اقوام متحدہ کی جانب سے اب تک ۱۱۰/ سے زائد قراردادیں پاس کی جا چکی ہیں، تاہم اب تک ان کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آسکا۔ اسرائیل اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہے اور عالمی طاقتیں معمول کے مطابق خاموشی کی سیاست یا عدم سنجیدگی کی سیاست کھیل رہی ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اقوام متحدہ میں پناہ گزینوں کا مسئلہ ۱۹۴۹ء سے ہے، اور ۱۹۷۴ء سے باقاعدہ اقوام متحدہ کی جانب سے بڑی اکثریت کے ذریعہ اس کے سلسلے میں قراردادیں پاس کی جارہی ہیں، لیکن اب تک ان کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا، اسرائیل نے اس کا ممبر ہونے کے باوجود اب تک ان میں سے کسی ایک کو بھی نہ مانا، اور اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ امریکہ اور دوسرے ویٹو پاور رکھنے والے ممالک نے تمام ہی انسانی اور اخلاقی اصول وضوابط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسرائیل کے حق میں بار بار ویٹو پاور کا استعمال کیا، تاکہ ان قراردادوں کا نفاذ ممکن نہ ہو سکے۔

فلسطینی مزاحمت کے آهنی عزائم اور عرب ممالک

۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۰ء فلسطینی مزاحمت کا زریں دور رہا ہے، اس دوران فلسطینی مزاحمت نے اردن کو مرکز بناتے ہوئے اسرائیل کے ہوش اڑا دیئے، لیکن ۱۹۷۱ء میں بیرونی دباؤ میں آکر اردن نے اپنی زمین کو استعمال کرنے پر روک لگا دی، چنانچہ فلسطینی مزاحمت نے لبنان کو اپنا مرکز بنایا، لیکن چند سال کے بعد ہی وہاں پر بھی مسائل پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ لبنان کی خانہ جنگی کے دوران فلسطینی مزاحمت اور ان کے ٹھکانوں کو خوب نشانہ بنایا گیا۔ ۱۹۷۸ء میں اسرائیل نے جنوبی لبنان پر چڑھائی کر دی، بعد میں ۱۹۸۲ء میں مزاحمت کے خلاف کارروائی کا دعوی کرتے ہوئے بیروت تک چڑھ آیا، اس طرح لبنان سے بھی فلسطینی مزاحمت کو کوچ کرنا پڑنا، اس طرح فلسطینی مزاحمت کے لیے مکمل طور پر عرب سرحدیں بند کر دی گئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فلسطینی مزاحمت کو عرب ممالک کی جانب سے کافی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا، بلکہ بسا اوقات ان کی جانب سے ان کا خطرناک استحصال بھی کیا گیا، تاہم اکتوبر ۱۹۷۳ء کی جنگ کے بعد حالات میں کافی تبدیلی آئی، اس جنگ میں مصر اور سیریا کو کافی حد تک کامیابی نصیب ہوئی۔ اسی کے آئندہ سال منظمۃ التحریر الفلسطینیۃ کو فلسطین کی نمائندگی کا درجہ دے دیا گیا، اور پھر دھیرے دھیرے ایک سازش کے تحت عرب ممالک اس مسئلے سے پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ بعد میں ایک بڑا سانحہ ۱۹۷۸ء میں کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کی شکل میں رونما ہوا، مصر نے اس پر دستخط کر دیئے، اس طرح ایک بڑی طاقت (مصر) اس

معرکہ سے الگ ہوگئی۔ اس کے بعد ہی عراق اور ایران جنگ ہوئی، جس نے ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۸ء کے درمیان دونوں ممالک کو توڑ کر رکھ دیا۔ نہ صرف یہ کہ سیاسی طور پر عرب ممالک یا مسلم ممالک مسئلہ فلسطین سے پیچھے ہٹنے لگے، بلکہ تیل کے داموں میں گراوٹ آنے کے سبب معاشی تعاون بھی کم سے کم ہوتا چلا گیا، اس کے بعد ۱۹۹۰ء میں کویت پر عراقی حملے کے بعد رہی سہی کسر بھی نکل گئی، اور عرب ممالک کا شیرازہ بری طرح بکھر گیا۔ اسی دوران سوویت یونین کا خاتمہ ہوا، اس سے بھی فلسطینی مزاحمت کو شدید جھٹکا لگا۔ ان واقعات نے فلسطینی مزاحمت کو کافی کمزور کر دیا، اور ان کے سامنے موجود امکانات محدود سے محدود تر ہو گئے۔ تاہم ان واقعات کے بعد جبکہ حکومتوں کی جانب سے توجہات کم سے کم ہوتی چلی گئیں یا ختم ہوگئیں، ملک و بیرون ملک میں فلسطین کے تعلق سے عام مسلمانوں میں کافی بیداری آئی، اس بیداری میں اخوان المسلمون سے وابستہ افراد کا نمایاں کردار ہے۔ اسی دوران فلسطین کے اندر آزادی اور انصاف کے حصول کے لیے کچھ منظّم گروپس بھی اٹھنے شروع ہو گئے، اس میں ستر کی دہائی کے وسط میں ’اُسرۃ الجہاد‘، ۱۹۸۰ء میں ’حرکۃ الجہاد الاسلامی‘، اور اسی کے آس پاس ’المجاہدون الفلسطینیون‘ قابل ذکر ہیں۔

فلسطینی جدوجہد، مصالحت کی راہ اور حماس کی ثبات قدمی

دسمبر ۱۹۸۷ء سے ستمبر ۱۹۹۳ء تک فلسطین کی جانب سے فلسطینی عوام کے حقوق اور آزادی کو لے کر زبردست انتفاضہ تحریک چلائی گئی، اور اس درمیان اسلامی عناصر خاص طور سے حماس کے مجاہدین ابھر کر سامنے آئے۔ اس انتفاضہ نے عالم عرب اور عالم اسلام میں ایک بار پھر مسئلہ فلسطین کو زندہ کر دیا، لیکن اس انتفاضہ تحریک کے راستے میں خود منظمۃ التحریر کی فلسطینی حکومت اور دوسرے عرب ممالک نے رکاوٹیں کھڑی کر دیں، اور اس کو کسی نتیجے تک نہ پہنچنے دینے کے لیے اپنے چھوٹے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ منظمۃ التحریر الفلسطینیۃ کا آغاز مسلح جدوجہد کے نام پر ہوا تھا، اور اسی وجہ سے اس وقت کی ’الفتح‘ اور دیگر آزادی پسند گروپس نے اس میں شمولیت اختیار کی تھی، اور یاسر عرفات اس کے رہنما منتخب ہوئے تھے، لیکن رفتہ رفتہ اس میں اسرائیل سے سمجھوتہ اور مصالحت کا رجحان پروان چڑھنے لگا، حتی کہ نومبر ۱۹۸۸ء میں اس کی جانب سے اقوام متحدہ کے ۱۸۱ نمبر کے فیصلے، جس کی رو سے تقسیم فلسطین کی بات کہی گئی تھی، اور امن کونسل کے ۱۹۶۷ء کے فیصلے کو، جس کی رو سے مسئلہ فلسطین کو پناہ گزینوں کا مسئلہ بنا کر پیش کیا گیا تھا، اور مصالحت کی بات کہی گئی تھی، دونوں کو قبول کرتے ہوئے اسرائیل کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ اور پھر ۱۹۹۱ء کو یہ عرب ممالک کے ساتھ مدرید میں اسرائیل کے ساتھ راست مذاکرات میں بھی شریک ہوئی، یہ مذاکرات دو سال تک بغیر کسی نتیجے کے جاری رہے،

اور مسئلہ کا کوئی حل سامنے نہیں آسکا۔ آخر کار ستمبر ۱۹۹۳ء میں اوسلو معاہدہ ہوا، جس پر اسرائیل کے ساتھ منظمۃ التحریر نے بھی سرکاری طور پر دستخط کیے۔ اس معاہدے کی رو سے فلسطین کے ۷۷ رفیصد علاقے پر اسرائیل کے قبضے کو تسلیم کیا گیا، اور مسلح جدوجہد کے خاتمے کا اعلان کیا گیا، اسی طرح منظمۃ التحریر نے اپنے دستور سے فلسطین کی آزادی سے متعلق تمام ہی نکات کو حذف کر دیا، اور جملہ مسائل کے سلسلے میں پرامن جدوجہد کا اعلان کیا۔ اس کے نتیجے میں جہاں ایک طرف اسرائیل کو تسلیم کرلیا گیا، وہیں اسرائیل کی جانب سے منظمۃ کو غزہ اور مغربی کنارے میں اقتدار دے دیا گیا، اس شرط کے ساتھ کہ آئندہ پانچ سالوں میں دیگر بنیادی مسائل بھی حل کر لیے جائیں گے۔

اوسلو معاہدہ فلسطینی عوام کے حقوق اور ان کی جدوجہد آزادی پر ایک خطرناک ضرب تھی، اس معاہدے سے قبل منظمۃ التحریر نے نہ تو فلسطین کے دیگر گروپس سے کوئی مشورہ لیا، نہ کوئی عوامی ریفرنڈم کرایا، فلسطینی عوام ارض فلسطین کو اپنا حق سمجھتے ہیں، اس حق سے دستبرداری کا کوئی حق منظمۃ التحریر کو نہیں تھا، چنانچہ اسلام پسندوں اور دیگر محاذ کے لوگوں نے، جن میں قومی نظریے کے حامل بھی تھے اور کمیونسٹ بھی، اس کی سخت مخالفت کی۔ اس کی مخالفت کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی رو سے فلسطین کے جو بہت ہی بنیادی مسائل تھے، ان کو پس پشت ڈال دیا گیا تھا، اور اسرائیلی وجود کو تسلیم کرنے میں ضرورت سے زیادہ بلکہ ناجائز حدود تک جلد بازی سے کام لیا گیا تھا۔ اس میں قدس شہر کے مستقبل پر کوئی بات نہیں تھی، اس میں فلسطینی پناہ گزینوں کے مستقبل سے متعلق کوئی بات نہیں تھی، اسی طرح مغربی کنارے میں اسرائیل کے توسیع پسندانہ منصوبوں وغیرہ کا بھی کوئی ذکر نہیں تھا۔ الغرض نہ جانے کتنے مسائل تھے جو اس معاہدے میں نظرانداز ہورہے تھے، اور نہ جانے کتنے مسائل تھے جو اس کے نتیجے میں پیدا ہورہے تھے، مثال کے طور پر اس معاہدے نے پوری دنیا، بالخصوص مسلم دنیا کو اس بات کا جواز فراہم کر دیا تھا کہ وہ اسرائیل سے سیاسی تعلقات قائم رکھ سکتے ہیں۔

دوسری انتفاضہ تحریک اور اس کے شاندار نتائج

اوسلو معاہدے کے بعد کئی سال تک اس بات کا انتظار ہوتا رہا کہ اب حالات کچھ سدھر جائیں گے، لیکن اسرائیل کی جانب سے مستقل جارحانہ کارروائیاں ہوتی رہیں، اور پانچ سال کے اندر معاملات سدھرنے کے بجائے اور زیادہ بگڑنے لگے، اس دوران انسانی حقوق کی بری طرح پامالی ہوئی، بری طرح قتل اور جارحیت کا رویہ اختیار کیا گیا، ۴۱۶۰ رفلسطینی شہید ہوئے، جبکہ ۴۵ رہزار سے زائد زخمی ہوئے، اور ملک میں ۵۸ رفیصد کے قریب بے روزگاری پھیل گئی۔ چنانچہ ستمبر ۲۰۰۰ء میں ایک بار پھر انتفاضہ کی تحریک شروع ہوئی، اس مرتبہ فلسطینی عوام نے، اور ان کے درمیان بالخصوص حماس اور دیگر

گروپس نے زبردست ثبات قدمی اور ہمت کا مظاہرہ کیا، اور اسرائیل کو اس بات کا احساس دلا دیا کہ اب معرکہ آسان نہیں ہے، اس معرکہ میں اہل فلسطین کا جو جانی و مالی نقصان ہوا، وہ الگ ہے، تاہم اسرائیل کے ۱۰۶۰ افراد قتل اور ۶۲۵۰ افراد شدید زخمی ہوئے، اس کے علاوہ اہل فلسطین نے اسرائیل کی معیشت اور دفاعی نظام کو زبردست نقصان پہنچایا۔ یہ تحریک مزاحمت کئی سال تک جاری رہی، آخر اکتوبر ۲۰۰۵ء میں اسرائیل کو غزہ کے علاقے سے انخلاء پر مجبور ہونا پڑا۔ اسی معرکہ کے دوران نومبر ۲۰۰۴ء میں یاسر عرفات کی وفات ہوگئی، اسی دوران فلسطین میں صدارتی اور پارلیمانی انتخابات کے مراحل آئے، اور قاہرہ میں فلسطین کے مختلف گروپس کے درمیان مارچ ۲۰۰۵ء میں سیاسی مفاہمت ہوئی، جس کے نتیجے میں ۲۰۰۶ء کے پارلیمانی انتخابات ہوئے اور اس میں حماس کو غالب اکثریت حاصل ہوئی۔ اس طرح دیکھا جائے تو اوسلو معاہدے کے بعد جہاں مسئلہ فلسطین سے عالم اسلام کی توجہ کم سے کم ہوگئی اور اسرائیل سے تعلقات کا انہیں ایک جواز مل گیا، وہیں دوسری طرف فلسطینی عوام میں آزادی اور جدوجہد کی ایک نئی روح اور تڑپ پیدا ہوئی، جس کے نتیجے میں عسکری اور سیاسی دونوں ہی محاذوں پر تحریک مزاحمت کو کامیابی نصیب ہوئی، غزہ سے اسرائیلی انخلاء اور حماس کی پارلیمانی انتخابات میں کامیابی اس دور میں مسئلہ فلسطین کا ایک اہم موڑ ثابت ہوئے۔

پارلیمانی انتخابات کے نتائج اور نئے مرحلے کا آغاز

پارلیمانی انتخابات میں حماس کی شاندار کامیابی کے بعد مغربی دنیا اور عرب دنیا، دونوں ہی جگہ ہلچل مچ گئی، فوراً ہی اس کے خلاف سازشیں شروع ہوگئیں، اور اسماعیل ہانیہ کی حکومت پر عرصہ حیات تنگ کیا جانے لگا۔ اس حکومت کو نہ اسرائیل نے تسلیم کیا، اور نہ ہی مغربی دنیا نے، اور ایک بڑی سیاسی سازش کے تحت محمود عباس کو استعمال کرتے ہوئے ان کی حکومت غزہ پٹی کے علاقے تک ہی محدود کردی گئی، اس طرح فلسطین میں دو حکومتیں قائم ہوگئیں، ایک غزہ پٹی کے علاقے میں حماس کی اور دوسری مغربی کنارے پر الفتح کی۔ اس موقع سے مغربی دنیا کی جھوٹی اور مفاد پرست سیاست کھل کر سامنے آ گئی کہ وہ جمہوریت کے نام پر کس طرح عوامی رائے کا استحصال کرتے ہیں، لیکن حماس کے لیے یہ ایک شاندار موقع تھا آزادئ فلسطین کے لیے تیاریاں کرنے کا، چنانچہ اسماعیل ہانیہ نے بہت ہی تیزی کے ساتھ غزہ پٹی کے علاقے میں تحریک مزاحمت کو مضبوط کرنا شروع کر دیا۔

غزہ پٹی میں حماس کی مضبوط ہوتی پوزیشن سے گھبرا کر اسرائیل نے ۲۷ دسمبر ۲۰۰۸ء میں غزہ پٹی پر سخت جارحانہ قسم کی فوجی کارروائیاں کیں، لیکن اس موقع پر حماس اور دیگر آزادی پسند گروپس نے جس عزم اور حوصلے کا ثبوت دیا، اور غزہ کے عوام نے جس طرح حماس کے حق میں ثبات قدمی کا مظاہرہ کیا،

اس نے اسرائیل کو بری طرح پست کر دیا۔ بالآخر ۱۸ر جنوری ۲۰۰۹ء کو اسرائیل نے بعض عرب ممالک کی وساطت سے جنگ بندی کا معاہدہ کرلیا۔ اس کے بعد سے حماس کی عوامی مقبولیت اور سیاسی وعسکری قوت میں زبردست اضافہ ہوتا چلا گیا، اسی دوران عرب دنیا میں انقلاب کی لہر چلی، جس کے نتیجے میں مصر میں اسلام پسند اخوانی رہنما صدر مرسی اقتدار میں آئے، ان کے اقتدار میں آنے سے حماس کو کافی تقویت ملی، اس سے گھبرا کر اسرائیل نے نومبر ۲۰۱۲ء میں ایک بار پھر غزہ پر حملہ کر دیا۔ اس مرتبہ مصر نے بہت ہی مضبوط اور اصولی موقف اختیار کیا، اور اب تک کے مصری موقف سے ہٹ کر حماس کے حق میں آواز اٹھائی، چنانچہ اسرائیل نے پہلی مرتبہ مذاکرات کے ٹیبل پر آ کر متوازن شروط پر صلح کی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جولائی ۲۰۱۳ء میں مصر میں فوجی انقلاب آ گیا، اور ایک مرتبہ پھر وہاں اسرائیل نواز حکومت اقتدار میں آ گئی، اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کافی تیاری کے ساتھ ۸ر جولائی ۲۰۱۴ء کو ایک مرتبہ پھر اسرائیل نے غزہ پٹی کو اپنی سخت ترین جارحیت کا نشانہ بنایا۔ اس بار اسرائیل کا حملہ جس قدر سخت اور منظم تھا، اس سے مضبوط حماس اور فلسطینی عوام کا عزم اور حوصلہ تھا، جس کے نتیجے میں مسئلہ فلسطین کی تاریخ میں پہلی بار اسرائیل مجبور ہو کر مذاکرات کے ٹیبل پر خود آیا، مصر کے ذریعہ سے جنگ بندی کی شرائط رکھی گئیں، جن کو حماس نے یکسر مسترد کر دیا، چنانچہ اسرائیل نے مجبور ہو کر حماس کی شرائط پر جنگ بندی سے اتفاق کرلیا۔
البتہ جیسے جیسے مسئلہ فلسطین آگے بڑھتا جا رہا ہے، اسی طرح حقائق کھل کر سامنے آتے جا رہے ہیں، چنانچہ پہلی دفعہ اس مسئلہ کی تاریخ میں دیکھا گیا کہ ایک دو مسلم ممالک کو چھوڑ کر تمام ہی مسلم ممالک اسرائیل کے خیمے میں کھڑے نظر آئے، امریکہ، اقوام متحدہ، مجلس امن، انسانی حقوق کے علمبردار سب کے سب اس دفعہ اسرائیلی جارحیت پر خاموشی سادھے بیٹھے رہے، یا اسے تقویت پہنچاتے رہے۔ بہر حال اب فلسطین کی عوام کو اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ انہیں اپنی آزادی کی یہ جدوجہد خود ہی سر کرنی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری انتفاضہ تحریک اور اس کے بعد پارلیمانی انتخابات میں حماس کی شاندار کامیابی مسئلہ فلسطین کی تاریخ کا ایک نیا موڑ ہے، اس نے جہاں فلسطینی عوام کو عزم اور حوصلہ دیا ہے، وہیں مجاہدین آزادی کو زبردست عسکری، سیاسی اور اخلاقی قوت بھی فراہم کی ہے۔

موجودہ صورتحال

غزہ پٹی کا علاقہ، جو تحریکِ انتفاضہ کے لیے نہ صرف ایک سیاسی مرکز ہے بلکہ اس کی عسکری قوت کا بھی مرکز ہے، اس علاقہ پر اسرائیل مستقل نظریں جمائے بیٹھا ہے۔ اس کے لیے وہاں برسر اقتدار سیاسی پارٹی حماس کو عالمی سطح پر بالکل الگ تھلگ کر دینے اور اس کی امیج بگاڑنے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ چنانچہ حماس کے خلاف عرب حکومتوں کو متحد کرنے اور دہشت گردی کے الزام کے تحت حماس کے

سلسلے میں سخت سے سخت موقف پر ان حکومتوں کو مجتمع کرنے کا منصوبہ گزشتہ دنوں بالکل واضح طور سے سامنے آگیا ہے۔ قطر کے سیاسی بحران کے پس پشت جو وجوہات یا پس پردہ مقاصد بیان کیے جارہے ہیں ان میں ایک بڑی وجہ حماس کو کمزور کردینے اور اس کے زیر تسلط علاقہ کو فلسطینی عوام سے خالی کرانے کا مذموم منصوبہ بھی ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق مصر کے سینائی علاقے میں ہزاروں ہزار کی تعداد میں خیموں کی تیاری کا کام جاری ہے، تاکہ مستقبل قریب میں غزہ پر اسرائیلی حملے کے بعد وہاں کے عوام کو سینائی علاقے میں منتقل کیا جاسکے۔

اس مذموم منصوبے کے پیش نظر فلسطینی عوام کو ورغلانے اور ان کے صبر کا امتحان لینے کے لیے ان کو طرح طرح سے ستایا اور آزمائشوں میں ڈالا جارہا ہے، تاکہ وہ تشدد کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہوجائیں اور اس طرح ان ظالم صہیونیوں کے لیے اپنے مذموم منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا موقع فراہم ہوجائے۔

گزشتہ دنوں سیکورٹی کے نام پر مسجد اقصی میں جو کچھ ہوا، اور اس کے بعد اسرائیلی فورسیس کی جانب سے جس طرح معاہدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مسجد اقصی کو اپنی تحویل میں لے لیا گیا، اور غالبًا نصف صدی کے بعد پہلی مرتبہ مسجد اقصی میں نماز جمعہ پڑھنے سے روکا گیا، مسجد کی بے حرمتی کی گئی، وہاں گولیاں تک چلائی گئیں، احتجاج کرنے پر امام اور نمازیوں پر زیادتی کی گئی، یہ تمام حرکتیں حالات کی سنگینی بیان کرنے کے لیے اپنے اندر بہت کچھ اشارے رکھتی ہیں، اور اس سنگینی پر غیر معمولی اضافہ مسلم حکومتوں کے رویوں سے ہوتا ہے جو یا تو مکمل خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں یا پھر علامتی بیانات سے امت کے استحصال کا کام کر رہے ہیں اور سوشل میڈیا پر واہ واہی لوٹ رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اسلام کے نام پر استحصالی سیاست کرنے والی، دولت واقتدار کے نشے میں دھت وہ حکومتیں جو تحریکِ حماس کو ختم کرنے پر سارا زور صرف کیے ہوئے ہیں، اور بڑھ چڑھ کر اسرائیل کے ناپاک وجود کو نہ صرف تسلیم کررہی ہیں بلکہ اس کے ساتھ معاہدات اور معاملات بھی کرتی جارہی ہیں، ان کے نزدیک قبلہ اول کی بازیابی اور سرزمین فلسطین کی آزادی کے سلسلہ میں کیا منصوبہ ہے؟ کیا دنیا بھر کی امت مسلمہ اور اس کی مختلف تنظیمیں، جماعتیں اور ادارے ان حکومتوں کے سامنے یہ سوال اٹھانے کا حوصلہ رکھتے ہیں؟!

ترانۂ فلاح: تلاش و تعبیر (۵)

ڈاکٹر امتیاز وحید، شعبۂ اردو، کروڑی مَل کالج، یونیورسٹی آف دہلی
Mobile:09811699616/email:ijnuwaheed@gmail.com

دانـــش گاہ فلاح کا ایک ترانہ، ۱۹۹۶ء کے فارغ، اس کے ایک لائق فرزند جناب ریاض قاصد کی سخنورانہ طبیعت کے طفیل معرضِ وجود میں آیا۔ شعر و سخنوری کے لیے فلاح کی فضایوں تو ہمیشہ ہی سے موافق رہی ہے تاہم ریاض قاصد ان لوگوں میں سے ہیں جو شاعرانہ طبیعت لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ عربی دوم سوم ہی میں ان پر نگاہیں اٹھنے لگی تھیں بلکہ زیادہ درست بات یہ ہے کہ اسی عرصے میں اساتذۂ سخن کی بعض تعریفات و توصیفات بھی ان کے حصے میں آئیں۔ ایسے کمیاب طبع لوگ عموماً بے نیازی کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں؛ خیر سے ریاض قاصد کا ایک مجموعہ ''محبتوں کے چراغ'' سامنے آ گیا ہے۔ یہ مجموعہ ان کی طبعی شگفتگی، ملی درد، غیر تقلیدی رویہ، احساسِ ذمے داری اور شاعری میں ان کی خودکار بنیادوں سے متعارف کراتا ہے۔ سر دست ریاض قاصد کے شاعرانہ تیور اور مادرِ علمی 'فلاح' کی محبت میں شرابور ان کا ترانہ ملاحظہ ہو ؎

ہم تو دیوانے ہوئے تیرے چمن زار فلاح
باعث رشک جہاں کیوں نہ ہو دستار فلاح

ہم کہ اک دشت تھے شاداب کیا ہے تونے
اپنے دریاؤں سے سیراب کیا ہے تو نے
اور آنکھوں کو عطا خواب کیا ہے تونے
تیرا اعجاز ہے اے گیسوئے خمدار فلاح

ہم تو دیوانے ہوئے تیرے چمن زار فلاح
باعث رشک جہاں کیوں نہ ہو دستار فلاح

زندگی رقص کناں ہے ترے میخانے میں
ڈھل گئی ہے مے شیراز بھی پیانے میں
دلکشی آئی ہے کیسی ترے افسانے میں
سادہ ورنگیں عجب ہیں در ودیوار فلاح

ہم تو دیوانے ہوئے تیرے چمن زار فلاح
باعث رشک جہاں کیوں نہ ہو دستار فلاح

تیرے دامن سے ہواؤں کی خبر ہم کو ملی
تیری آغوش میں تابندہ سحر ہم کو ملی
فکرتازہ ملی بالیدہ نظر ہم کو ملی
کیا کھلا یہ در گنجینہ اسرار فلاح

ہم تو دیوانے ہوئے تیرے چمن زار فلاح
باعث رشک جہاں کیوں نہ ہو دستار فلاح

تیرے ذرّوں سے پشیماں ہے چمک تاروں کی
دھوم کچھ ایسی مچی ہے ترے شہ پاروں کی
آرزو مند ہے دنیا ترے گفتاروں کی
فن وتہذیب کا گہوار ہے دربار فلاح

ہم تو دیوانے ہوئے تیرے چمن زار فلاح
باعث رشک جہاں کیوں نہ ہو دستار فلاح

علم کے نور سے پرنور ہے تیرا یہ نصاب
کوندتی رعد ہے کیسی تہ دامان حجاب
کاش تا حشر چمکتا رہے تیرا مہتاب
یونہی ہمدوش ثریا رہے مینار فلاح

فلاح کے موجودہ ترانے کے علی الرغم ریاض قاصد نے اپنے ترانے کی تشکیل کے لیے خودساختہ زمین کا استعمال کیا ہے۔ مجی ڈاکٹرعمیر منظر نے بجاطور پران کی شناخت محبت کے جذبے کے مغنی کے طور پر کی ہے۔ جذبۂ محبت کی پاس داری اوراس کی بقاکے لیے وہ اپنی شاعری میں بارہاایسے جزیرے کی

جستجو میں سرگرداں دکھائی دیتے ہیں، جو ہوا و ہوس سے پاک محض اقلیمِ محبت ہو۔ ریاض قاصد کے یہاں عمدہ اور لطیف شاعرانہ خیالات کا ماٴخذ محبت میں ان کا غایت درجہ اعتماد وایقان ہے۔

ترانے کے فنی سروکار سے متعلق جو باتیں اس سلسلہ وار تحریر کی ابتدا میں رقم کی گئی تھیں، ان کا اطلاق بڑی خوبی سے ریاض قاصد کے ترانے میں ہوتا ہے۔ یعنی بھرپور شاعرانہ اظہار، جذبات کا بہاؤ اور وارفتگی۔ ترانے میں شاعر کی بیشتر لفظیات کا سیاق ان کے اساسی جذبۂ محبت سے مستعار ایک کہکشاں کی صورت ہویدا ہے۔ خمدار گیسو، درپن، مہ واختر، مے شیراز، تابندہ سحر، گنجینہ اسرار، کوندتی رعد، ہمدوش ثریا وغیرہ۔ رومان اور حسن کی روشنی سے بھرپور لفظیات بالیدہ فکر کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ریاض قاصد جامعۃ الفلاح کے پروردہ ہیں لہٰذا وہ اس کے درپن میں آگہی کے نئے طور اور انداز سے واقفیت رکھتے ہیں۔ رواں بحر کے حصار میں شاعر کے خیالات فلاح کی عظمت کو پوری شدت اور محبت سے نشان زد کرتے ہیں۔ کبھی وہ مہ واختر کو اس کی محفل میں اُتار کر ہفت افلاک کو تحیر میں مبتلا کرتے ہیں، تو کبھی اس کے میخانے اور پیمانے میں مے شیراز کو ڈھلتے ہوئے دکھاتے ہیں۔ محبوب کے حسن اور اس کی خوبیوں کا اس درجہ مبارک اور مقدس اظہار محض شاعرانہ ہنرمندی یا کرشمہ سازی نہیں بلکہ اظہار کی یہ سطح شاعر کو اس وقت ہاتھ آتی ہے جب اس کی ذات اور اس کے محبوب کی دوئی یا ثنویت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ صوفی شاعر سراج اورنگ آبادی کو محبوب (اللہ) سے اپنی قربت کا جب ادراک ہوا تو اس کیفیت کو انھوں نے یوں نظم کیا ؎

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پہ جو دھری تھی سو دھری رہی
خبرِ تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

شاعری اسی تناظر میں الہام کہی جاتی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ ترانہ خلق کرتے ہوئے ریاض قاصد کی روح مادرِ علمی فلاح کے در و دیوار، نظام، فکر، منشور، ماحول اور وہاں کی علمی اور عملی زندگی کی روح سے ہم آہنگ ہوگئی ہے اور دوئی کا خاتمہ ہوگیا ہے۔

ریاض قاصد نے جس پس منظر میں فلاح کو فن وتہذیب کا گہوارا بتایا ہے، اس سے ہر اس فرد کو اتفاق ہوگا جس کے دل میں مدارسِ اسلامیہ کا احترام اور ذہن وفکر میں اس کے مقاصد اور اہداف کا ذرہ برابر بھی تحفظ باقی ہوگا۔

۳ رنومبر ۱۹۹۴ء کو طیبہ منزل کے سالانہ تعلیمی مظاہرے کے موقعے سے ایک نظم پیش کی گئی۔ نظم

شعبۂ اعلی میں انگریزی کے ایک استاذ ڈاکٹر محمد شفیع سیتا پوری نے 'طیبہ منزل فلاح کا دل ہے' کے عنوان سے چھوٹے بچوں کے دارالاقامہ 'طیبہ منزل' کو بنیاد بنا کر لکھی تھی۔ پہلے نظم سے لطف اندوز ہوں:

مخزنِ علم و فن کی محفل ہے ‏ ‏ طیبہ منزل فلاح کا دل ہے
دیکھ لی جس نے اس کی رعنائی ‏ ‏ ہوگیا دل سے اس کا شیدائی
اس پہ قربان ماہِ کامل ہے ‏ ‏ طیبہ منزل فلاح کا دل ہے
اس کی دو منزلہ عمارت پر ‏ ‏ روز و شب کھیلتے ہیں شمس و قمر
کھیل میں آسماں بھی شامل ہے ‏ ‏ طیبہ منزل فلاح کا دل ہے
صحنِ طیبہ جسے نصیب ہوا ‏ ‏ عالم و فاضل و ادیب ہوا
کامیابی کی پہلی منزل ہے ‏ ‏ طیبہ منزل فلاح کا دل ہے
فجر کی جب اذان ہوتی ہے ‏ ‏ اس کی دوبالا شان ہوتی ہے
اپنی عظمت کی آپ حامل ہے ‏ ‏ طیبہ منزل فلاح کا دل ہے
بچے بچے کو پیار دیتی ہے ‏ ‏ مامتا اور دلار دیتی ہے
سب کے غم اور خوشی میں شامل ہے ‏ ‏ طیبہ منزل فلاح کا دل ہے
تربیت جس سے اس نے پائی ہے ‏ ‏ دور اس سے ہر اک برائی ہے
اس سے لرزاں وجودِ باطل ہے ‏ ‏ طیبہ منزل فلاح کا دل ہے
کام اونچا مقام اونچا ہے ‏ ‏ اے شفیع اس کا نام اونچا ہے
اس کا کوئی نہیں مقابل ہے
طیبہ منزل فلاح کا دل ہے

بحر سادہ، قافیہ سہل، لفظیات مختصر، سادگی سے مملو اور تصنع سے بے نیاز۔ ان تمام خوبیوں کا عکس اس نظم میں ملتا ہے۔ اس سادگی میں مقدس آرزوؤں کا تخم بویا گیا ہے۔ نظم طیبہ منزل کے ننھے مکینوں کی ذہنی استعداد اور ان کی امنگوں کی ترجمان ہے۔ دارالاقامہ کی رعایت سے یہ نظم بچوں میں مثالیت کے جذبے کو بیدار کرتی ہے اور مدِ مقابل سے خود کو بہتر بننے اور اپنی خوبیوں کو نکھارنے کی سمت مائل کرتی ہے۔ فلاح کا ایک نمایاں وصف طلبہ میں مقابلہ جاتی ذہنیت کا فروغ ہے۔ یہ اس کی عمدہ مثال ہے۔

ڈاکٹر محمد شفیع سیتا پوری اعلی تعلیم یافتہ ہیں۔ تاریخ، انگریزی اور اردو میں کان پور یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویٹ، ایل ایل بی اور اردو میں لکھنؤ یونیورسٹی سے 'نعتیہ شاعری کا ارتقا' کے موضوع پر پی ایچ ڈی ہیں۔ سات شعری مجموعوں [شگفتہ زخم، اشکِ عقیدت، گڑ بڑ گھوٹالہ، کرنوں کا سفر، صلی اللہ علیہ وسلم، صدف

اور سفر حج کی روداد پر مبنی 'اجالوں کے شہر سے'] کے خالق ہیں۔علم و آگہی کے شیدائی اور درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔فلاح میں شعبۂ اعلی میں انگریزی کے استاد رہے ہیں۔سر دست لکھیم پور کے ایک کالج میں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔موصوف مرحوم ابوالمجاہد زاہد صاحب کے بھانجے ہیں اور شاعری میں اپنے ماموں کی طرح جادۂ ادب اسلامی کے قافلے میں شامل ہیں۔

حیات نو اکتوبر ۱۹۸۷ء کے شمارہ میں 'حیاتِ نو' کے عنوان سے مولانا ابوالبیان حمّادؔ کی ایک نظم شائع ہوئی، جو 'حیاتِ نو' کے تعلق سے موصوف کے دلی جذبات کو پیش کرتی ہے۔یہ ترانے کے سلسلے کی براہ راست کوئی کڑی نہیں ہے تاہم فلاح کے طلبۂ قدیم کا ترجمان ہونے کے سبب اسے فلاح کے مجموعی تصور میں ایک عضوِ حساس کا درجہ دیا جاتا ہے لہٰذا اس سے صرفِ نظر ممکن نہیں؛ سر دست اس پر گفتگو کا سیاق بھی اس کی یہی حیثیت ہے۔اہم بات دراصل نظامِ عمل اور اس سے وابستگی کی ہے۔سالم نظریے سے وابستہ افراد کو اپنے مطلوبہ نظام کے ہر اک پہلو میں حسن کی تمازت نظر آتی ہے۔ابوالبیان صاحب نے جب کعبۂ دل میں جھانکا اور نظامِ فلاح میں دلبری کی خوبی تلاش کی تو حیاتِ نو نے ان کے پیر پکڑ لیے۔فنکار مسکرایا اور یوں گویا ہوا ؎

عالم میں پھیل جائیگی جب دینِ حق کی ضَو
ہوگی طلوع امن و محبت کی صبحِ نو

تسکیں کہاں ہے راہِ نوردانِ شوق کو
یہ جُست خیز، یہ تگ و تاز یہ گریز و دَو

ظلمت شبِ حیات کی سر پیٹنے لگی
مدّت کے بعد شکر ہے، لو پھٹ گئی وہ پَو

نیکی کا پھل سزا نہ بدی کا صِلہ جزا
کس طرح تخمِ نیم سے پیدا ہو فصلِ جَو

مکھن ضرور، ملت بیضا، میں ہے ابھی
لیکن یہ شرط ہے میرے ساتھی اسے بِلو

ہرگز جزائے خیر نہیں دس پہ منحصر
اخلاص ہو تو ایک کی ملتی ہے سات سَو

بس اس کی فکر ہے کہ یہ ریلا کہاں رُکے
ہر سمت چل پڑی ہے برائی کی ایک رَو

باطل کے سر پہ بھوت تشدد کا ہے سوار
اوہام نِت نئے ہیں، خرافات نو بنو

پھونکے گا خرمنِ خس و خاشاکِ کفر کو
اسلام کے نظام مبارک کا سیلِ نَو

فکر و نظر میں آتا ہے جس وقت انقلاب
پھر دل میں پھوٹتی ہے شعاعِ حیاتِ نَو

حمّادؔ پر ہے بارشِ الہام کا نزول
آتے ہیں ذہن میں جو خیالاتِ نو بنو

حمّادؔ صاحب نے بالکل درست کہا ہے کہ فکر و نظر میں انقلابی تبدیلی راہ پانے کے بعد حیاتِ نو کی کرنیں دل کو منور کرتی ہیں۔اخلاقی اقدار، بصیرت اور تعمیر پسندی پر استوار رسائل کبھی معلم، مربی، مصلح تو

کبھی ہمدرد معالج کا کردار نبھاتے ہیں۔تازہ کار عرفان و آگہی کی ترسیل ان کی اساسی ذمے داریاں ہیں۔سرسید کی ترجیحات میں دخیل 'تہذیب الاخلاق' کا اصلاح پسند تاریخی پس منظر اس نکتے کو زیادہ بہتر طور پر واضح کرتا ہے۔۱۹۷۸ء میں 'حیاتِ نو' کا خمیر انہی پاکیزہ مقاصد کے تحت اٹھایا گیا تھا۔تاہم کسی علمی ادارے کے ترجمان کے لیے جس جانفشانی، دیدہ وری اور کمٹمنٹ کی ضرورت تھی وہ اس کی پرورش و پرداخت پر صرف نہیں کی گئی۔فلاح جیسے تحریک اساس ادارے اپنے ترجمان کو زمانے کی ہوا و حوادث سے نہیں بچا پائے۔بارہا اس کا ناطقہ بند ہوا، کبھی سہ ماہی، کبھی ششماہی، تو کبھی ماہانہ؛ حد تو یہ ہے کہ دو دو ماہ کے پرچے اکٹھے نکالے گئے اور کوئی تدبیر اسے حالات کے مدوجزر سے نہیں بچا سکی۔اب تو ہند میں اردو، اردو رسائل، مسلم ادارے اور مسلمانوں کی ساکھ کی یوں بھی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔یہ مقام شکوہ سنجی اور محرومی تقسیم کرنے کا نہیں، حوصلے کو صیقل کرنے کا ہے۔مقامِ شکر ہے کہ فی الوقت حیاتِ نو فلاحی برادری کو تیزی سے متوجہ کر رہا ہے اور اس کے مندرجات کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جا رہا ہے۔گزشتہ ساڑھے چار سالوں سے یہ پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے۔حیات نو کے گزشتہ شمارے آن لائن کر دئے گئے ہیں، ازسرنو اس کا رجسٹریشن کرایا گیا ہے۔انتظام و انصرام کی سطح پر مطلوبہ فعالیت کا جو شکوہ ہے، وہ بے جا بھی نہیں تاہم امید قوی ہے کہ حیاتِ نو اسم بامسمیٰ ہوگا اور مولانا حمّاد صاحب کے شاعرانہ خیالات حقائق کی ٹھوس زمین پر برگ و بار لائیں گے۔یورپ میں مسٹر اسٹیل اور اڈیسن کے میگزین نے تطہیر معاشرہ کا جو انقلابی کارنامہ انجام دیا اور سرسید کے تہذیب الاخلاق کے پیش نظر جو اصلاحی تقاضے تھے اس سے زمانہ واقف ہے۔قلمی اور مالی تعاون کے کارواں میں خیر کے مزید ہاتھ آگے بڑھیں تو حیاتِ نو تعمیر اور تہذیب کی نئی تاریخ لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔اس میں شک کی بھلا کیا گنجائش ہے۔

نظم کے خالق جنت مکانی مولانا ابوالبیان حماد کا شمار ملک کے چوٹی کے اسلامی اسکالرس میں ہوتا ہے۔اوّلاً دارالعروبہ سے وابستگی رہی، جہاں مولانا مودودی کی اردو کتب کے عربی تراجم ہوتے تھے۔بعدازاں مرحوم جامعہ دارالسلام عمرآباد سے تاحیات وابستہ رہے۔موصوف عربی ادب کے استاذ اور ادب اسلامی کے نمائندہ شاعر کی حیثیت سے معروف تھے۔مولانا کی شاعری ہمیشہ اسلامی اقدار اور تحریکیت کے تابع رہی۔شاعری کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، ایک دفعہ فلاح بھی آنا ہوا تو اس موقع سے جناب ابرار اعظمی کی جانب سے ان کے نعتیہ مجموعہ پر انھیں اکرام و توصیف سے نوازا گیا۔طبیعت میں بلا کی انکساری تھی، مدرسے میں ان کے احترام کا ایک توانا سیاق طلبہ کے لیے ان کی ہمدردی، شفقت اور ہم نوائی تھی۔مولانا جماعتِ اسلامی کے قدیم کارکن تھے۔

نایاب خطوط

ذیل میں مولانا شہباز اصلاحی صاحب رحمہ اللہ کے دوخطوط بنام مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی اور ڈاکٹر اشہد جمال ندوی شامل اشاعت کیے جارہے ہیں۔
توفیق خداوندی شامل حال رہی تو اس کالم کے تحت آئندہ بھی اہم اور نایاب خطوط کی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا رہے گا۔ **(مدیر)**

(۱)

بنام مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی

۲رمئی ۱۹۷۴ء

برادر عزیز! اللہ تعالی آپ کو مع اہل وعیال و متعلقین کے اپنی امان میں رکھے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خط ملا۔ خیریت معلوم ہوئی۔ میں تو خود ہی خط وغیرہ لکھنے میں اس قدر کوتاہ ہوں کہ کسی سے شکایت کیا کروں گا۔ کسی کا بھی خط آجائے خواہ جتنے دن میں بھی آئے میں غنیمت ہی سمجھتا ہوں اور آپ کے بارے میں تو معلوم ہے کہ تعلیم کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ گھر کا پورا بار ہے اور پھر اب مکان کی تعمیر کا سلسلہ بھی چل پڑا ہے۔ اللہ تعالی ہر مرحلہ میں کامیاب اور بامراد بنائے، آمین۔ والد صاحب، والدہ صاحبہ، سلامت اللہ صاحب اور گھر کے دوسرے افراد کو سلام کہیے۔ محی الدین غازی میاں کو دعائیں۔ اللہ تعالی انہیں صحیح معنوں میں آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنائے۔

آپ نے دو سوال لکھے ہیں۔ یہاں کے ماحول میں اس طرح کے سوال کچھ اجنبی سے معلوم ہوتے ہیں۔ جو سمجھ میں وقتی طور پر آرہا ہے لکھتا ہوں محض تعمیلِ حکم میں۔ ورنہ جانتا ہوں کہ اس سے بہتر آپ خود ہی سوچ سکتے ہیں۔

ا۔ سورہ شعراء میں حضرت موسی علیہ السلام کا قصہ، نبوت ملنے سے لے کر فرعون کے غرق ہونے

تک کا ہے، جس میں ہر جگہ یہی پہلو ابھرا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے۔ وہ اپنے نبیوں اور مومنین کی مدد پر پوری طرح قادر ہے اور بڑے سے بڑے سرکش انسان کو ایک اشارہ میں ختم کر سکتا ہے۔

سورہ نمل میں بہت اختصار ہے۔ اس میں صرف فرعون کے جان بوجھ کر انکار اور اس کی ہلاکت کی طرف اشارہ کیا گیا، اس کے مقابلہ میں مومنین کی کامیابی کی تصریح نہیں کی گئی ہے۔ گویا یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ انسان اگر عقل سے کام لے۔ آفاق وانفس کے دلائل پر سنجیدگی سے غور کرے، ناشکری اور ہٹ دھرمی کا رویہ نہ اپنائے تو توحید بالکل فطری سی چیز ہے۔ لیکن اگر ہٹ دھرمی اور ضد سے کام لے، ناشکری کرے، تو شرک میں مبتلا ہوتا ہے اور تباہ ہوتا ہے۔ اسی لیے حضرت سلیمان علیہ السلام کی شکرگزاری اور ملکۂ سبا کا عقل سے کام لینا سب بیان ہوا ہے۔

اور سورہ قصص میں تو بڑی تفصیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کس طرح ایک مظلوم ومجبور قوم کو کامیاب کرتا اور ترقی دیتا ہے۔ کس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فرعون کے گھر میں پرورش کراتا ہے اور ہر موقع پر ان کی حفاظت کرتا ہے اور فرعون اور قارون کو باوجود اقتدار اور دولت کے ہلاک کر دیتا ہے۔

مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ سورہ شعراء میں اللہ تعالیٰ کے عزیز ورحیم ہونے کا پہلو ابھار کر توحید کو ثابت کیا گیا ہے اور تاریخی دلیل دی گئی ہے کہ دیکھو فرعون کو ہلاک کیا اور بنی اسرائیل کو ان کا قائم مقام بنایا۔ سورہ نمل میں انسان کی معقولیت اور شکر کے جذبہ کی بنیاد پر توحید کو ثابت کیا گیا ہے اور تاریخی حیثیت سے اشارہ کیا گیا کہ فرعون نے نامعقولیت، ہٹ دھرمی اور نمک حرامی کا رویہ اپنایا اس لیے اللہ کو نہیں تسلیم کیا اور ہلاک ہوا۔ برخلاف اس کے حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکۂ سبا نے شکر اور معقولیت کا رویہ اپنایا تو انہیں اللہ کی معرفت نصیب ہوئی اور بامراد ہوئے۔ اور سورہ قصص میں یہ پہلو اختیار کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی زمین میں فساد اور سرکشی کو گوارا نہیں کر سکتا ہے۔ یہ دنیا کوئی اندھی نگری نہیں ہے جہاں چوپٹ راجا کی سلطنت ہو۔ اللہ تعالیٰ سرکشوں اور مفسدین کو پکڑتا ہے اور مظلوموں کی مدد فرماتا ہے، اور اس سلسلہ میں عجیب وغریب حیران کن طریقوں سے اپنی قدرت کے کرشمے دکھاتا ہے۔

۲۔ سورہ نمل کا عمود جیسا کہ اوپر کے اشارات سے معلوم ہوا یہی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی معقولیت اور اس کے شکر کے جذبہ کی بنیاد پر توحید کو ثابت کیا جائے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ میں بھی بتایا گیا ہے کہ ان کے اندر شکر کا جذبہ تھا تو وہ ہر طرح کا اقتدار پا کر بھی بہکے نہیں بلکہ توحید پر جمے رہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام یا تو حکومت سبا سے ناواقف رہے ہوں جیسا کہ متبادر ہے یا اجمالی علم رہا ہو، ملکۂ سبا کی سورج پرستی کی تفصیل نہ معلوم ہو۔ انہ صرح ممرّد (الخ) کے سلسلہ میں یہ بات ذہن

میں آتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کے ساتھ دو معاملہ کیا۔ ایک تو اس کا عرش منگوا کر اس میں کچھ تبدیلی کروادی۔ دوسرے شیشہ کی عمارت میں لے گئے جس پر پانی کا دھوکہ ہوا۔ ان دونوں ہی طرح سے دراصل یہ بتانا مقصود تھا کہ انسانی عقل پر بالکلیہ بھروسہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ نگاہیں ظاہر سے دھوکہ کھا سکتی ہیں۔ آدمی اگر حقیقت سے واقف نہ ہو تو محض قیاس سے بڑی مضحکہ انگیز غلطیاں کرسکتا ہے۔ چونکہ تخت سے ملکہ اچھی طرح واقف تھی اس لیے اس میں اسے دھوکہ نہیں ہوا لیکن محل سے ناواقف تھی، وہاں علم نہیں تھا محض ظاہری حالت دیکھ کر قیاس کیا تو ایسا مضحکہ انگیز مغالطہ ہوگیا۔ اسی طرح سورج کے سلسلہ میں اسے قیاس کی بنا پر مغالطہ ہوا اور وہ اسے خدا سمجھ بیٹھی۔ اس وقت اس کو انسانی سمجھ کی اس کمی کا احساس ہوگیا اور سمجھ میں آ گیا کہ پیغمبر کو علم ہے، ان کی رہنمائی یہاں بھی قبول کرنی چاہیے۔

اس وقت یہی کچھ سمجھ میں آیا۔ پتہ نہیں کچھ کام کی بات ہے یا محض بکواس۔ خدا کرے آپ اس میں سے کچھ کام کی بات نکال لیں۔

والسلام

شہباز

(۲)

بنام ڈاکٹر اشہد جمال ندوی

عزیز گرامی!

سلام مسنون

آپ کا خط غالباً کئی ہاتھوں سے ہوتا ہوا دیر سے ملا۔ کچھ دیر مجھ سے ہوئی۔ بہر حال اب جواب کی نوبت آ رہی ہے۔

۱۔ آپ اپنے خُطّہ میں جزوی ترمیم کرسکتے ہیں۔ مقالہ پیش کرتے وقت یہی ترمیم شدہ خطہ درج کیجیے۔

۲۔ مولانا فراہیؒ کے مشہور اساتذہ تو یہی ہیں۔ کسی اور کا نام مجھے نہیں معلوم۔ بظاہر مولانا فاروق چریا کوٹی سے استفادہ کا موقع نہیں ملا۔

۳۔ مولانا فراہیؒ پر حدیث سے بے اعتنائی کا الزام بالکل بے بنیاد ہے۔ اس کی اصل صرف اتنی ہے کہ مولانا قرآن مجید کی تفسیر میں نظم کلام اور عربی اسلوب ومحاوروں کو اولین اہمیت دیتے ہیں۔ اگر کسی آیت کے واضح مفہوم سے کوئی حدیث متصادم معلوم ہوتی ہے تو آیت کے مدلول کو ترجیح دیتے ہیں اور

حدیث میں تاویل کرتے ہیں یا توقف کرتے ہیں، جبکہ عام طور پر دوسرے لوگ حدیث کے مدلول کو ترجیح دے کر آیت کی تاویل کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کبھی کبھی شانِ نزول کی نوعیت سمجھنے کا اختلاف بھی سبب بنتا ہے۔ عام طور پر لوگ ہر شانِ نزول کو نزولِ آیت کا حقیقی سبب سمجھ لیتے ہیں اور اسی لیے ایک ایک آیت کے کئی شانِ نزول دیکھ کر کہہ دیتے ہیں کہ یہ آیت متعدد بار نازل ہوئی حالانکہ محققین نے وضاحت سے لکھا ہے کہ شانِ نزول کا ہمیشہ یہ مطلب نہیں ہوتا۔ اس الزام کا ایک اور باعث تفسیر سے متعلق حدیثوں کا ضعف بھی ہے۔ تفسیری روایتوں میں ضعاف کی کثرت کے تمام محدثین قائل ہیں لیکن اس زمانہ میں عام مزاج یہ ہوگیا ہے کہ کسی تفسیری روایت پر اگر شبہہ کیا جائے تو لوگ نفسِ حدیث کے انکار کا الزام عائد کر دیتے ہیں۔

میرے علم میں صرف بدر کے قیدیوں کے سلسلہ میں جو حدیث آئی ہے اور جنگ پیش نظر تھی یا قافلہ پر حملہ مقصود تھا، اس سلسلہ میں جو حدیث آئی ہے، انہی دو حدیثوں کے سلسلہ میں کوئی کہنا چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ صحیح حدیث کے خلاف مطلب لیا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں مولانا شبلی نے سیرت النبیؐ میں جو بحث کی ہے اور مولانا داؤد اکبر صاحب مرحوم نے ما کان لنبی ان یکون له اسری، الخ پر جو مضمون لکھا ہے وہ غلط فہمی دور کرنے کے لیے کافی ہے۔

جہاں تک معجزہ سے انکار کے الزام کا تعلق ہے یہ بھی بے بنیاد ہے۔ آپ کے مجلّہ علوم القرآن کے تازہ شمارہ ہی میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے مضمون میں خود حضرت سید صاحبؒ کی تصریح موجود ہے کہ پوری تیسری جلد میں سیرت کی، جو معجزہ ہی پر ہے مولانا فراہیؒ کے مشوروں کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ عجیب ستم ظریفی ہے معجزہ کی کسی خاص نوعیت کے انکار کو لوگ معجزہ کا انکار قرار دینے لگتے ہیں۔ کبھی کسی متعین معجزہ کے ثبوت میں کمزوری دکھانے کو مطلق معجزہ کا انکار قرار دیا جاتا ہے۔ مولانا فراہیؒ نے القائد الی عیون العقائد میں معجزہ کا ذکر کیا ہے اور خود تفسیر سورۂ فیل میں جو غالباً یہ الزام عائد کرنے والوں کی سب سے بڑی دلیل ہے مولانا نے تصریح کی ہے کہ معجزہ کا انکار الگ چیز ہے اور کسی معجزہ کی عقلی توجیہ کر دینا الگ چیز ہے۔

۴۔ حروف مقطعات والی بحث آپ مقالہ میں شامل کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کوئی عقیدہ تو طے نہیں ہوا ہے کہ انحراف لازم آئے۔ بس اتنی احتیاط چاہیے کہ اور توجیہات کی تغلیط نہ کی جائے۔

والسلام

شہباز

نعت رسول ﷺ

اللہ اللہ ایسی عظمت اور یہ شانِ رسولؐ
مالک ارض وسماء ہے خود ثناخوانِ رسولؐ

کون کرسکتا ہے اس کے رتبۂ عالی کا درک
ہے خدائے لم یزل ہی مرتبہ دانِ رسولؐ

آپ کے عفو وکرم کا یہ کرشمہ دیکھئے
ہوگئے کفارِ مکہ جاں نثارانِ رسولؐ

عورتوں کے سر پہ رکھا آپؐ نے عزت کا تاج
صنف نازک بھول پائے گی نہ احسان رسولؐ

آپؐ نے بخشی جہاں کو روشنی وآگہی
کرگیا دنیا کو مالا مال فیضان رسولؐ

ہیں ابوبکر وعمر فاروق، عثمان وعلی
پیش وایانِ رہِ حق، ماہتابانِ رسولؐ

ان کے قول وفعل پر ہیں جان ودل سے جو فدا
وہ بروز حشر کہلائیں گے خاصانِ رسولؐ

ذلت وخواری مسلماں کا مقدر ہوگئی
جب سے اس کے ہاتھ سے چھوٹا ہے دامانِ رسولؐ

ہے دعا عارفؔ کی یارب جب تلک زندہ رہوں
چھوٹنے پائے نہ مجھ سے کوئی فرمانِ رسولؐ

حافظ احسان الحق عارفؔ آئمی،
شیخ التفسیر کلیۃ البنات، جامعۃ الفلاح

جو ڈٹے ہوئے ہیں محاذ پر......

نہ اسیر گنبد شاہ کا نہ فقیر حسن نگاہ کا
نہ حریص تاج و کلاہ کا نہ مرید دولت و جاہ کا
نہ سکندری سے کوئی غرض نہ مریض خوف سپاہ کا
نہ مفکروں میں شمار کر نہ مناظروں میں تلاش کر

جو ڈٹے ہوئے ہیں محاذ پر مجھے ان صفوں میں تلاش کر

ابھی شوق ہے میرا نا رسا ابھی نیم رس میرا میکدہ
یہ حنین و بدر کے راستے کہیں تشنگی کہیں کربلا
میرا سر گرے تیری راہ میں، یہی آرزو یہی التجا
وہ جو شب سے برسرِ جنگ ہیں انھیں جگنوؤں میں تلاش کر

جو ڈٹے ہوئے ہیں محاذ پر مجھے ان صفوں میں تلاش کر

میرے راستوں میں قدم قدم جو لہو کے نقش و نگار ہیں
تری چاہ ہیں، ترا شوق ہیں، ترا عشق ہیں، ترا پیار ہیں
مجھے خوف طولِ سفر نہیں، کہاں منزلیں کہاں دار ہیں
کبھی خیبروں میں تلاش کر کبھی حیدروں میں تلاش کر

جو ڈٹے ہوئے ہیں محاذ پر مجھے ان صفوں میں تلاش کر

جو فصیلِ شہر پہ جگمگا تی سی روشنی کا ظہور ہے
ترے کج کلاہوں کے سامنے مری کجروی کا ظہور ہے
ترے جگنوؤں کا طفیل ہے مری بے خودی کا ظہور ہے
وہ جو کٹ مریں ترے نام پر انھیں بے خودوں تلاش کر

جو ڈٹے ہوئے ہیں محاذ پر مجھے ان صفوں میں تلاش کر

نہ تجلیاں ہیں وہ طور میں نہ وہ گرمیاں رہیں نور میں
نہ وہ سوز،ساز طیور میں نہ وہ درد قلبِ صبور میں
ترا نام تحت شعور میں، ترا ذکر غیب و حضور میں
نہ شراب میں نہ سرور میں مجھے وحشتوں میں تلاش کر

جو ڈٹے ہوئے ہیں محاذ پر مجھے ان صفوں میں تلاش کر

تیری جستجو تیری آرزو تیری بندگی میری آبرو
میں حقیر قطرۂ آب جو تو ہی یم بیم تو ہی جو بجو
ہو پیام تیرا ہی کو بکو، ہو نظام تیرا ہی چار سو
مجھے مثل نکہت گل کہیں تیری خوشبوؤں میں تلاش کر

جو ڈٹے ہوئے ہیں محاذ پر مجھے ان صفوں میں تلاش کر

نہ شفق میں ہے کوئی سرگی نہ گلوں میں ہے کوئی تازگی
یہ جلے جلے کہیں آشیاں یہ بجھی بجھی کہیں روشنی
کہ حدی کی لے، ذرا تیز کر یہاں چھن نہ جائیں قلم کہیں
وہ پرند نغمہ سرا ہوئے وہ نقاب روئے سحر اٹھی
وہ نقاب روئے سحر اٹھی میرے آبلوں میں تلاش کر

جو ڈٹے ہوئے ہیں محاذ پر مجھے ان صفوں میں تلاش کر

اسے عزمِ قلبِ صہیب دے اسے سوزِ روح بلال دے
وہ یقین دے وہ کمال دے، وہ عزیمتوں کی مثال دے
جو فراز دار ہو سامنے تو ہجوم شوقِ وصال دے
میں ہوں تیرا بزمیؔ خونچکاں ترے مجرموں میں تلاش کر

جو ڈٹے ہوئے ہیں محاذ پر مجھے ان صفوں میں تلاش کر

سرفراز بزمیؔ فلاحی،راجستھان

گر اَب نہ جگے ۔۔۔

یہ حرص و ہوس کے متوالے جب جینا دوبھر کر دیں گے
سانسوں پہ لگا دیں گے پہرہ اور ناک میں پانی بھر دیں گے
جب ظلم و تشدد کا ہر سو اک محشر برپا کر دیں گے
جب حق کو مٹانے کے در پر سب طاغوتی جم جائیں گے
تب جاگیں گے کب جاگیں گے
بالآخر اک دن جگنا ہے
گر اب نہ جگے کب جاگیں گے

ہر صبح ہمارے کانوں میں اخبار صدائیں دیتا ہے
آنکھوں میں سلگتے منظر کی پر شور فضائیں دیتا ہے
مظلوموں کی، مجبوروں کی دلسوز بلائیں دیتا ہے
جس روز کوئی سرخی بن کر اخبار کی ہم خود ابھریں گے
تب جاگیں گے کب جاگیں گے
بالآخر اک دن جگنا ہے
گر اب نہ جگے کب جاگیں گے

غزہ عراق ایران تلک برما بنگلہ افغان تلک
پھر مصر و یمن سوڈان تلک اور شام سے ہندوستان تلک
دنیا کا احاطہ کر لیجے سب جھگڑے ہیں ایمان تلک
ہم تنہائی میں بیٹھ کے جب اپنا ایمان ٹٹولیں گے

تب جاگیں گے کب جاگیں گے
بالآخر اک دن جگنا ہے
گر اب نہ جگے کب جاگیں گے

اس فانی دنیا کی خاطر اب کتنا ڈھونگ رچانا ہے
اس وقتی شان و شوکت کا کس کس پر رعب جمانا ہے
یہ سونے چاندی ہیرے کیا ، سب چھوڑ یہیں مر جانا ہے
جب دو گز کپڑا دے کر کے سب مٹی میں دفنا دیں گے

تب جاگیں گے کب جاگیں گے
بالآخر اک دن جگنا ہے
گر اب نہ جگے کب جاگیں گے

جب ننھی کلیاں اور غنچے برباد یہ گلچیں کر دیں گے
حالات کو بد سے بدتر اور ماحول کو سنگیں کر دیں گے
جب خون کی ہولی سے قاتل بستی کو رنگیں کر دیں گے
جب نبیؐ کی پیشین گوئی کو ہم صادق آتے دیکھیں گے

تب جاگیں گے کب جاگیں گے
بالآخر اک دن جگنا ہے
گر اب نہ جگے کب جاگیں گے

جب دھرتی پھاڑ کے نکلے گا حیوان کوئی بدصورت سا
جو جہاں وہیں تھم جائے گا بے جان پڑی اک مورت سا
اک عالم دہشت کا ہوگا اک عالم طاری ہیبت سا
جب خون کی بارش برسے گی اور مردے اٹھ کر بھاگیں گے

تب جاگیں گے کب جاگیں گے
بالآخر اک دن جگنا ہے
گر اب نہ جگے کب جاگیں گے

جب خود آنکھوں سے دیکھیں گے ہم لوگ قیامت کا منظر
کانا دجال کا فتنہ اور یاجوج تباہی کا لشکر
پھر ظاہر ہونا مہدی کا عیسی کا اترنا گنبد پر
اشجار و جبل کو پیروں پر جب خود سے چلتا دیکھیں گے

تب جاگیں گے کب جاگیں گے
بالآخر اک دن جگنا ہے
گر اب نہ جگے کب جاگیں گے

دریائی طوفان اٹھے بھوکمپ سے دھرتی تھرائے
پر اتنے شور شرابے سے ہم لوگ نہیں ہیں جگ پائے
ممکن ہے اک دن سورج بھی مغرب سے اجاگر ہوجائے
ہر چیز فنا ہو جائے گی جب صور فرشتے پھونکیں گے

تب جاگیں گے کب جاگیں گے
بالآخر اک دن جگنا ہے
گر اب نہ جگے کب جاگیں گے

جب نام و نشاں اس دنیا کا ہر نقشے سے کھو جائے گا
ان جگ مگ چاند ستاروں کا جب نور کہیں کھو جائے گا
یہ نیل گگن آکاش بھی جس دن روئی کا ہو جائے گا
جب حشر کے میداں میں سب کے اعمال تھمائے جائیں گے

تب جاگیں گے کب جاگیں گے
بالآخر اک دن جگنا ہے
گر اب نہ جگے کب جاگیں گے

جب جاگیں گے دہرائیں گے تاریخ کے پچھلے پنوں کو
ناکردہ گناہوں کے مجرم جیلوں میں سارے اپنوں کو
کس طرح ملایا ظالم نے مٹی میں ان کے سپنوں کو
جب خاک اڑا دی جائے گی تب پٹی آنکھ کی کھولیں گے

تب جاگیں گے کب جاگیں گے
بالآخر اک دن جگنا ہے
گر اب نہ جگے کب جاگیں گے

ہے وقت ابھی جگ جائیں سبھی فرصت ہے ابھی مہلت ہے ملی
آئے گی قضا جب لینے کو پھر کوئی نہیں ہے باہو بلی
اس موت کے آگے قارون و فرعون کی بھی نہ ایک چلی
اک روز ہمارے اپنے بھی اعصاب کڑے ہو جائیں گے

تب جاگیں گے کب جاگیں گے
بالآخر اک دن جگنا ہے
گر اب نہ جگے کب جاگیں گے

یہ وقت بہت ہی نازک ہے مقصد سے لپٹنا ہی ہوگا
جس کارن خلقت ہے اپنی اس اَور پلٹنا ہی ہوگا
اللہ کی رسی سے سب کو اک ساتھ چمٹنا ہی ہوگا
اللہ کے انکاری ورنہ دجال کی صورت آئیں گے
ہم سوئے ہیں اے ابن چمن ، ہم سوئے ہی رہ جائیں گے
پھر کیسے،کہاں،کب جاگیں گے جب جاگیں گے،تب جاگیں گے
بالآخر اک دن جگنا ہے گر اب نہ جگے کب جاگیں گے

اشھد بلال چمنؔ،متحدہ عرب امارات

تعارف وتبصرہ

لیمپ پوسٹ کی حکایت

افسانہ نگار: محمد یحییٰ جمیل

صفحات:12، **قیمت** :150روپے، **اشاعت**:2012ء

ناشر: محمد یحییٰ جمیل، بیت الجلیل، پلاٹ نمبر9، اسیر کالونی وی ایم وی، امراوتی۔444604

بیان واقعہ محض خبر نویسی ہے افسانہ نویسی نہیں۔خبر دراصل دروازے کا فریم ہے جس میں لگے پردے کے پیچھے کہانی کا رُخ انور موجود ہوتا ہے۔اسی کو تلاش کر کے سامنے لانا کہانی ہے۔افسانہ نگار کا تخیل ایک تخلیقی عمل ہے۔جب وہ تخیل کے دروازے پر پہنچ کر کھل جا سم سم کہتا ہے تو کہانی مسکرا کر اسے خوش آمدید کہتی ہے۔افسانہ پیکر اتنا فسوں خیز ہے کہ جو بھی اسے ایک نظر دیکھ لیتا ہے وہ اسی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔محمد یحییٰ جمیل خبروں کے انبار لگانے والوں میں سے نہیں بلکہ خبر کے پس پردہ کہانی کی دریافت کرنے والے قلم کار ہیں۔ وہ خواب سے حقیقت تک کے سفر میں اقدار کے زوال کا ماتم بھی کرتے ہیں۔

'لیمپ پوسٹ کی حکایت' محمد یحییٰ جمیل کا اولین فکشن زائچہ ہے۔انھوں نے علامت سازی اور بیانیہ کے ذریعہ افسانہ کو وقار بخشا ہے۔وہ حقیقت بیان کرنے کے لیے محیر العقول فضا کا تانا بانا تیار کرتے ہیں۔ان غیر واقعی علامتوں سے اصل صورت حال کی آئینہ داری ہوتی ہے۔یہ علامتوں کے پس پردہ جھانکتی سچائیاں ہی ہیں جو کہانی کو معنی خیزی کا پیراہن عطا کرتی ہیں۔مجموعہ میں شامل تقریباً ڈیڑھ درجن افسانے خبر کے تأثر کو شدید تر بناتے ہیں اور غور وفکر کا نیا زاویہ فراہم کرتے ہیں۔'قصاصِ بنیان کے' جن کے توسط سے مسلم طبقہ میں پھیلی منافرت اور تعصب کے سدباب کی سعی ہے۔جن تمام صعوبتوں کو چٹکیوں میں راحت میں تبدیل کر سکتا ہے مگر یہ معمہ لاینحل ہے۔دلوں کے درمیان دن بہ دن پھیلتی جا رہی خلیج کو پاٹنا اُس کے لیے کار دشوار ہے اسی لیے وہ بطور سزا اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دیتا ہے۔یہ خوں بہا قصاص کا طالب ہے جو کون دے گا؟ یہ سوال اپنی جگہ برقرار ہے۔'پر میرا' بھیشم پتاما کا تیر اندازی سکھا کر درون آچاریہ سے بطور معاوضہ انگوٹھے کی طلبی ہے۔عہد حاضر میں یہ مجبوری کا سودا بن چکا ہے۔شاگرد کو بہر حال خدمت استاد کر کے حصول علم کا بدلہ دینا ہے۔ اس میں سرکاری ملازمتوں کا لالچ ہو یا کوئی دوسری غرض وغایت معلم کی نظر کرم کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

'چھپکلی لڑکی' قرآن کی بے حرمتی کرنے والی دوشیزہ پر عذاب کا تسلط ہے۔یہ ایک خواب ہے مگر یہ خبر درس عبرت رکھتی ہے اور نصیحت دیتی ہے کہ لیڈران اور قائدان عظام اپنی کرسیوں سے چپکے ہوئے ہیں۔وہ

اصولوں کی خلاف ورزی اور سر عام قانون کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ کیا بطور سزا وہ چھپکلی سے آگے بڑھ کر گرگٹ، بندر یا کوئی دوسری مخلوق بنا دیئے جانے کے لائق نہیں جو اپنی ذات سے مطلب رکھتا ہے دوسروں سے نہیں۔ 'شیطانی فرمان' ابلیس لعین کے احکام وفرامین کی ایک جھلک ہے جس پر عمل کرنے والوں کی کثیر تعداد ہے جبکہ فرمان الٰہی پر چلنے والوں کی تعداد خاصی قلیل ہے۔ 'آنکھیں' رخسار، زبان، دہن اور دست و پا کی ایک دوسرے پہ دشنام طرازی ہے۔ زبان کے سبّ وشتم کا خمیازہ دانتوں کو بھگتنا پڑا۔ کرے کوئی بھرے کوئی کا عملی نمونہ دیکھ کر چشم کو اشکبار ہونے پہ مجبور ہونا پڑا۔ 'منہدی' حنا کے مدھم رنگ کے پس پردہ صبغت اللہ میں کمی ہے جس کا واضح ثبوت مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے سے مل جاتا ہے۔

'سفر' چندن گڑھ کی سیاحت کا احوال ہے۔ واپسی میں جب جنازہ پہ نظر پڑتی ہے تو دوسرے سفر کی یاد آجاتی ہے جو سفر نہیں سقر ہوگا۔ 'خوں آشام' خون چوسنے والی بلا کا انجام بد ہے جس نے غلطی سے سیاست داں کے لہو سے پیاس بجھانے کی کوشش کی تھی۔ جو عوام کے لہو سے اپنے وجود کو سیراب کرے ویمپائر بھی اس کے مقابلہ میں کم ترین ہے۔ کھٹمل اور مچھر نے پہلے ہی اس سے شکست تسلیم کر لی ہے۔

'داشتہ' غربت واجل کا تصادم ہے جس میں ہمیشہ شکست غربت کو ہی نصیب ہوتی ہے۔ 'سپوت' میں ماں کی بیماری کے مقابلہ میں مورتی کی توہین فزوں تر ہے کیونکہ وہ قوم کا مسئلہ ہے انفرادی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ممتا ہار گئی اور بھارت ماتا کی تصویر بھی شرمسار ہوگئی۔ ٹائٹل کہانی 'لیمپ پوسٹ کی حکایت' اسٹریٹ لائٹوں کے دن میں روشن کرنے کی عجوبہ روایت کا سچ ہے۔ بجلی کے محکمہ کی کارگزاری کے سبب جنوں کو گھومنے پھرنے میں دشواری ہونے لگی تو اس نے حضرت انسان کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ آخر یہ معاہدہ طے پایا کہ محکمہ برقیات عالم بیداری میں اپنی ڈیوٹی پوری کرے گا اور پھر مکمل طور پر خواب غفلت کا ثبوت دے گا۔ 'ہجر/وصل' ازدواجی زندگی میں خود کو گم کر دینے کے بعد محفل یاراں سے دوری ہے۔ شریک حیات کے فراق میں راتیں طویل ہو جاتی ہیں جبکہ حلقہ احباب میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

'دلدل' پاؤں کو پاپوش سے چھپانے کا المیہ ہے جسے ایک حقیر جانور نے جان بچا کر عجیب سزا سے ہم کنار کر دیا تھا۔ 'خمار' ظاہر وباطن کے تضاد کا نمونہ ہے تو 'شکست' عمارت سازی کی تقلید کے پس پردہ مشرق ومغرب کی تہذیب کی نقل مکانی۔ 'اعاظم رجال' ماضی کے ایک عہد کی صداقت اور موجودہ عہد کے انسانی دماغ کا تقابلی مطالعہ ہے جس میں 'جو رہبر ہے وہی دراصل رہزن ہی کا قالب ہے'۔ 'ٹھاکر کے ہاتھ' گبر سنگھ کا خطرناک ردعمل ہے جو پردہ سیمیں سے باہر آکر اپنا انتقام لیتا ہے۔ کہانی، مصنف اور قاری ادبی کارگزاری کا مثلث ہے۔ یہاں اول وثانی کے شانہ بہ شانہ کارٹونوں نے سونے پہ سہاگہ کا کام کیا ہے۔ یوں ثالث کا جھکاؤ از خود ہونا فطری ہے۔ یہ افسانوی مجموعہ توجہ مبذول کرائے گا ایسی امید کی جا سکتی ہے۔ (**تبصرہ**: سعید اختر اعظمی)

آپ کے خطوط

محمد معاذ، مدیر معاون ماہنامہ ’’رفیق منزل‘‘، نئی دہلی

حیات نو کا تازہ شمارہ قدرے تاخیر سے موصول ہوا۔ سرورق کا ڈیزائن محترم مدیر مسئول کی سادگی پسند ذہنیت کا ثبوت فراہم کرتا ہوا محسوس ہوا۔ مدیر محترم ابوالاعلی سبحانی نے اپنے اداریے میں دعوت کے ضمن میں ایک نکتہ کی بات لکھی ہے جسے اکثر حضرات نظر انداز کر جاتے ہیں۔ وہ یہ کہ ’’یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ہر نبی کی دعوت میں پہلی ترجیح عقائد کی طرف دعوت کو ہی حاصل رہی ہے اور یہ کہ تمام ہی نبیوں کے دعوتی نمونوں سے یہ پیغام ملتا ہے کہ داعی سماج میں ’’ناصح اور امین‘‘ کی شناخت اور پہچان بنائے‘‘۔ (صفحہ۴) دعوت دین کی اہمیت، ضرورت اور اس کے لامحدود فیوض و برکات کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو اس راہِ نجات کا مسافر رہا ہو۔ تاہم اس کی ایک جھلک دکھانے کے لیے جناب نسیم احمد غازی صاحب کا انٹرویو بڑا مفید معلوم ہوتا ہے۔ مولانا کا احساس ہے کہ موجودہ حالات کے تمام پیچیدہ اور لاینحل مسائل کا واحد حل دعوت دین میں پنہاں ہے، چنانچہ وہ دین اسلام کو آبِ حیات سے تعبیر کرتے ہیں اور مجروح سلطان پوری کا یہ شعر بلا اختیار ذہن کے کسی گوشے سے سنائی دیتا ہے کہ ’’دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں ۔۔۔ میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا‘‘۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ اسلام کے دامن میں پناہ لینے کے بعد ابن آدم حیات جاودانی پالیتا ہے۔ قرآن کریم سے استفادے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ان تراجم کا مطالعہ کیا جائے جو مترجمین نے بڑی ہی عرق ریزی سے کیے ہیں، البتہ ان سے استفادے کی صحیح شکل کا ادراک ہونا بہت ضروری ہے۔ جناب ڈاکٹر محی الدین غازی صاحب کی تحریر ’’اردو تراجم قرآن پر ایک نظر‘‘ اس سلسلے میں بڑی رہنمائی کرتی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ رہنمائی کا یہ سلسلہ ہنوز جاری رہے گا، اور اللہ نے چاہا تو یہ مضامین جلد ہی کتابی شکل میں منظر عام پر آجائیں گے۔

رحمت عالم ﷺ تمام عالم کے لیے رہتی دنیا تک بشیر و نذیر بنا کر بھیجے گئے تھے۔ آپؐ کی رحلت کے بعد اب یہ ذمہ داری امت مسلمہ کی ہے کہ وہ اپنے کردار سے اس بات کا ثبوت دے کہ وہ رحمت عالم ﷺ کی امت ہے۔ کیا آج امت اس امر کی گواہی دے رہی ہے؟ اس بات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جانا چاہیے کہ مسلمانان عالم کا عمومی رویہ دیگر لوگوں کے لیے اسلام سے نزدیکی کا سبب

بن رہا ہے یا دوری کا۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ ''آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو۔۔پیکرِ عمل بن کر غیب کی صدا ہوجا''۔محترم مولانا ذکی الرحمٰن صاحب کا احساس یہ ہے کہ ''امت دعوت اپنے ہفتے بھر بعد کے اجتماع میں جن دعاؤں پر سب سے زیادہ زور دیتی ہے وہ بلاوجہ مقفی و مسجع عبارتوں میں تمام غیر مسلم کفار ومشرکین کو مورد لعنت و مستحق عذاب الٰہی قرار دینا ہے''۔اس سے قطع نظر کی یہ احساس کس حد تک بجا ہے، مولانا کو ان عبارتوں کی نشاندہی کی جانی چاہیے تھی جن اس طرح کی غیر اسلامی اور دعوتی مزاج کے منافی نکات شامل ہیں، تاکہ ائمہ وخطیب اپنی اصلاح کرسکیں نیز اس بات کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے کہ یہ عبارتیں کیوں کر ہمارے جمعہ کے خطبوں میں رائج ہوگئی ہیں، تاکہ اصلاح کا عمل سہل ہوجائے۔

ادارہ ادب اسلامی ہند کی تاریخ لکھنے والا کوئی بھی مورخ جناب حفیظ میرٹھی علیہ الرحمہ سے صرف نظر نہیں کرسکتا، بلکہ ان کے بغیر ادارے ہی کی نہیں، برصغیر ہندو پاک کی ادبی شناخت بھی ادھوری ہے۔ جناب حفیظ میرٹھی علیہ الرحمہ کی شاعری نے یہ ثابت کردیا کہ آج بھی ایسے افراد زندہ ہیں جو اپنے اشعار سے تیر ونشتر کا کام لینا جانتے ہیں۔جن کے اشعار غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں اور انسان کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں۔حفیظ میرٹھی علیہ الرحمہ نے اپنے ہم عصر شعراء کی بے راہ روی پر نیز ان کے شاعرانہ ذوق پر سوالیہ نشان لگایا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ''رعنائی افکار وخیالات کا مطلب۔۔عریانی افکار وخیالات نہیں ہے''۔جناب سید راشد حامدی صاحب کا مضمون ''فرض محبت کا شاعر۔حفیظ میرٹھی'' حفیظ کی شاعری کا ایک عمدہ مطالعہ ہے۔حفیظ نے اپنی شاعری میں عصر حاضر کے سلگتے مسائل پر تبصرہ کیا ہے اور بہت خوب کیا ہے۔نیز قارئین ادب کو مقصد زندگی کے اسلامی تصور سے آشنا کرنے کی کوشش کی ہے۔جناب راشد صاحب کا بھی یہی احساس ہے۔لکھتے ہیں کہ

''اقبال کے کلام میں نصب العین اور مقصدیت کے تعلق سے جو واضح شعور ملتا ہے، ان کے بعد اس کی واضح ترین مثال حفیظ کے کلام میں نظر آتی ہے'' (صفحہ ۷۳)۔

جناب راشد صاحب حفیظ میرٹھی علیہ الرحمہ کی زندگی کے بعض گوشے بھی پیش کردیتے تو مضمون کی خوبصورتی اور افادیت میں مزید اضافہ ہوجاتا۔

رسالے کے اخیر میں برادر مخدوم منہاج الدین فلاحی کے انتقال کی خبر پڑھ کر افسوس ہوا۔مرحوم بہت سی اخلاقی خوبیوں کے مالک تھے، اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے، آمین

جامعہ کے لیل ونہار

مصباح الباری فلاحی، استاذ شعبۂ اعلیٰ، جامعۃ الفلاح

جامعہ کی جانب سے طلبہ فضیلت کے لیے الوداعی تقریب

۹؍مئی ۲۰۱۷ء بروز سہ شنبہ ابواللیث ہال میں عربی ہشتم سے فارغ ہونے والے طلبہ کے ساتھ ایک الوداعی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ اس نشست کی صدارت نائب ناظم جامعہ مولانا مقبول احمد فلاحی صاحب اور نظامت نگرانِ اعلیٰ مولانا اعجاز احمد قاسمی صاحب نے انجام دی۔ سب سے پہلے عربی ہشتم سے فارغ ہونے والے طلبہ نے اپنا اپنا تفصیلی تعارف اور اپنے مقاصد اور عزائم بیان کیے۔ اس کے بعد تین نمائندہ طلبہ، عبداللہ سراج، جاوید احمد، شاہ زیب نے جامعہ اور اس کے تعلیمی وتربیتی ماحول سے متعلق اپنے مجموعی تأثرات پیش کیے۔

صدارتی خطاب میں مولانا مقبول احمد فلاحی صاحب نے فرمایا کہ علم اور نصب العین کی جو امانت آپ لوگوں کو ملی ہے اسے کبھی ضائع نہ کیجئے گا، قرآن وسنت سے اپنا مضبوط تعلق استوار رکھئے گا۔

مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی صاحب نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ صالح انسان وہی ہے جو ہمیشہ اپنی کمیوں اور کوتاہیوں پر نظر رکھے اور ہمیشہ یہ بات پیش نظر رکھے کہ ’’ومن احسن قولاً ممن دعا الی اللہ وعمل صالحا وقال اننی من المسلمین۔‘‘

مہتمم تعلیم وتربیت مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب نے زادِ راہ پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ سب کے پیش نظر دین کا احیاء ہو، اور آپ سب بہترین داعی بنیں، بس یہی آپ سب سے مطلوب ہے۔

مولانا اعجاز قاسمی صاحب نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ آپ لوگ جہاں کہیں بھی رہیں اسلامی تشخص کو برقرار رکھیں اور قرآن وسنت پر عمل کرتے رہیں۔

جامعہ میں نئے تعلیمی سیشن کا آغاز

اعلان کے مطابق ۵؍جولائی بروز چہارشنبہ جامعہ کے نئے تعلیمی سال کا آغاز ہوا۔ تجدید داخلہ اور

نئے داخلے کے بعد ۱۶؍جولائی ۲۰۱۷ء بروز یکشنبہ سے باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہو چکا ہے۔ تاخیر سے آنے والے طلبہ کو حسب سابق تادیبی کارروائی کا سامنا کرنا پڑا۔

جامعہ کا نیا تعلیمی کلینڈر بابت ۱۸-۲۰۱۷ء مطابق ۳۹-۱۴۳۸ھ

تعلیمی سال کا آغاز: ۵؍جولائی ۲۰۱۷ء بروز چہارشنبہ

داخلہ وتجدید داخلہ: ۶؍جولائی ۲۰۱۷ء بروز پنجشنبہ

داخلہ ٹسٹ اول: ۹؍جولائی ۲۰۱۷ء بروز یکشنبہ

داخلہ ٹسٹ ثانی: ۱۲؍جولائی ۲۰۱۷ء بروز چہارشنبہ

آغاز تعلیم: ۱۶؍جولائی ۲۰۱۷ء بروز یکشنبہ

تعطیل عید الاضحی: ۳۱؍اگست تا ۷؍ستمبر ۲۰۱۷ء

امتحان ششماہی: ۱۷؍دسمبر ۲۰۱۷ء تا ۲۸؍دسمبر ۲۰۱۷ء

تعطیل سرما: ۳۰؍دسمبر تا ۱۸؍جنوری ۲۰۱۷ء

آغاز ششماہی ثانی: ۲۰؍جنوری ۲۰۱۸ء

اعلان نتائج ششماہی: ۳۱؍جنوری ۲۰۱۸ء

سالانہ امتحانات: ۱۴؍اپریل ۲۰۱۸ء تا یکم مئی ۲۰۱۸ء

اعلان نتائج سالانہ: ۸؍مئی ۲۰۱۸ء

آغاز تعطیل کلاں: ۹؍مئی ۲۰۱۸ء

جامعہ میں داخلہ ٹسٹ (اول)

۹؍جولائی ۲۰۱۷ء بروز یکشنبہ جامعہ کے تعلیمی کلینڈر کے مطابق پہلا داخلہ ٹسٹ ہوا، جس میں ۱۱۵؍طلبہ اور ۱۲۳؍طالبات نے کامیابی حاصل کی۔ کامیاب ہونے والے طلبہ کی فہرست کچھ اس طرح ہے:

شعبہ اعلی طلبہ

عربی اول: ۴۲

عربی چہارم: ۲

شعبہ حفظ وثانوی طلبہ

درجہ ہشتم: ۷

درجہ ہفتم: ۳
درجہ ششم: ۲
حفظ ششم: ۱۲

شعبہ اعلی طالبات

عربی اول: ۶۳
عربی چہارم: ۱۵
عربی دوم: ۸

حفظ وثانوی طالبات

درجہ ہشتم: ۲
درجہ ہفتم: ۶
درجہ ششم: ۱۰
حفظ ششم: ۱۹

جامعہ میں داخلہ ٹسٹ (ثانی)

دوسرا داخلہ ٹسٹ ۲۰۰ روپے لیٹ فیس کے ساتھ ۱۲ر جولائی ۲۰۱۷ء بروز چہارشنبہ کو ہوا۔ جس میں ۷ر طلبہ اور ۳۴ر طالبات نے کامیابی حاصل کی۔ کامیاب ہونے والوں کی فہرست درج ذیل ہے:

شعبہ طلبہ

عربی اول: ۴
درجہ ہشتم: ۲
درجہ ششم: ۱

شعبہ طالبات

عربی اول: ۲۲
درجہ ہشتم: ۱۰
درجہ ہفتم: ۲
درجہ ششم: ۴
حفظ ششم: ۵

انجمن طلبہ قدیم کی جانب سے استقبالیہ تقریب

۹؍مئی ۲۰۱۷ء فضیلت سے فارغ ہونے والے طلبہ کے لیے انجمن طلبہ قدیم کی جانب سے استقبالیہ تقریب منعقد ہوئی۔جس کی نظامت مولانا رئیس احمد فلاحی صاحب نے کی۔مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی صاحب اور مولانا محمد عمران فلاحی صاحب نے طلبہ سے خطاب کیا۔اخیر میں مولانا احسان الحق فلاحی صاحب کی دعا پر پروگرام کا اختتام ہوا۔نشست کے اختتام پر طعام کا بھی نظم کیا گیا۔

ممبئی یونٹ کے انتخابات

۸؍جولائی ۲۰۱۷ء کو انجمن طلبہ قدیم ممبئی یونٹ کے نئے انتخابات ہوئے۔خازن انجمن جناب ادہم فلاحی صاحب کی نگرانی میں یہ انتخاب عمل میں آیا،اس موقع پر سابق صدر انجمن جناب ملک محمد فیصل فلاحی صاحب بھی موجود تھے۔انتخابات کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

صدر یونٹ: مولانا عبدالبر اثری فلاحی

ممبران شوری: ۱۔برادر ادہم علی ۲۔برادر شمس الدین ۳۔برادر علی حسن ۴۔برادر خالد مخدومی ۵۔برادر صبغت اللہ عمر ۶۔برادر خلیل الرحمٰن ۷۔برادر ابوسعد ۸۔برادر عرفان بیگ

حیات نو کی تقسیم

نئے تعلیمی سال کے آغاز پر جامعہ تشریف لائے مہمانوں اور نئے طلبہ کے درمیان حیات نو کے پرانے شمارے تقسیم کیے گئے اور فارغین جامعہ کی علمی سرگرمیوں سے انہیں واقف کرایا گیا۔

احسان عالم فلاحی کے بھائی سے ملاقات

گزشتہ دنوں احسان عالم فلاحی کے بھائی افتخار عالم کے ساتھ کچھ شرپسندوں نے جارحانہ سلوک کیا،جس کے بعد انجمن کا ایک وفد صدر انجمن جناب مشرف حسین صاحب کی قیادت میں ۱۰؍جولائی کو جیون نرسنگ ہوم میں افتخار عالم کی عیادت اور مزاج پرسی کے لیے تشریف لے گیا۔وفد میں مولانا انعام اللہ فلاحی صاحب اور مولانا محمد اسماعیل فلاحی صاحب بھی شامل تھے۔اس دوران ناظم جامعہ مولانا محمد طاہر مدنی صاحب بھی متأثر فیملی بالخصوص احسان عالم فلاحی سے مستقل رابطے میں رہے اور متأثرین کی قانونی مدد کے سلسلے میں رہنمائی کرتے رہے۔اے پی سی آر کے نیشنل کوآرڈی نیٹر ایڈووکیٹ ابوبکر سباق سبحانی اور ان کی ٹیم اس سلسلے میں قانونی کارروائی انجام دے رہی ہے۔